ہفت روزہ
زندگی
لاہور
۵ تا ۱۱ صفر ۱۳۹۹ھ
۵ تا ۱۱ جنوری ۱۹۷۹ء

۱۹۷۹ کا خوفناک منصوبہ

- پیر پگارا ۹ جنوری کو اتحاد سے الگ ہو جائیں گے
- ۱۷ جنوری سے قبل نیا اتحاد وجود میں آجائے گا
- پنجاب کو مفلوج کرنے کے لیے نیا اتحاد کافی ہوگا
- ہمارے لیے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بہتر اور کوئی نہیں
- بلوچستان میں تیلی لگانے کی دیر ہے
- فوجیوں اور جماعتیوں کا روزِ حساب جلد شروع ہوگا
- مسٹر بھٹو یقینی طور پر بچ جائیں گے

قیمت : ۳ روپے

قادیانیوں کی بھیانک سازش پکڑی گئی

اندر صفحہ ۱۳ ملاحظہ فرمائیں

بنام زندگی

اصل واقعہ یوں ہے

ہفت روزہ "زندگی" کے یکم دسمبر تا ۷ دسمبر ۷۸ء کے شمارے میں "نصف لاکھ روپے کی رشوت ٹھکرا دی۔ دیانت داری کی ایک قابل تقلید مثال" کے عنوان سے مکتوب کوئٹہ چھپا ہے۔ اس میں محکمہ بی اینڈ آر بلوچستان کے ایک سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی طرف سے ۵۰ ہزار روپے کی رشوت کو ٹھکرا دینے کے واقعے کی تعریف کی گئی ہے، مگر پس منظر کے طور پر جن واقعات پر روشنی ڈالی گئی، ان میں کچھ باتیں درست نہیں ہیں، مثلاً مکتوب میں ایک جگہ لکھا گیا ہے:

"جنرل ضیاء الحق نے جولائی میں بلوچستان کا دورہ کیا، تو اعلان کیا کہ بلوچستان کے لیے چالیس بلڈوزر منگوائے جائیں گے۔ حکومتِ بلوچستان نے فیصلہ کیا کہ یہ بلڈوزر محکمہ زراعت خریدے گا اور اسی کی تحویل میں یہ اس لیے گے تاکہ زمینداروں اور کسانوں کو استعمال کے لیے دیے جا سکیں حکومت بلوچستان نے مارشل نامی بلڈوزر خریدنے کی سفارش کی تھی، جبکہ مرکز کے ادارے ایم سی پی نے سفارش کی ہے کہ کیٹرپلر بلڈوزر خریدے جائیں۔ عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ الائیڈ انجینئرنگ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مارشل کے بجائے کیٹرپلر بلڈوزر خریدنے کی سفارش کرائی الائیڈ انجینئرنگ سروسز کراچی کی یہ خواہش تھی کہ ان بلڈوزروں کی سپلائی کا ٹھیکہ اسے ملے، یہ خواہش تو بُری نہ تھی، ہر کاروباری فرم کا یہ حق ہے مگر اس کام کے لیے فرم کے ایک ذمہ دار نے جو رویّہ اختیار کیا، اس کے باعث وہ قانون کی گرفت میں آگیا، وہ دراصل حکومتِ بلوچستان کے ذمہ دار افسروں کو "متاثر" بلکہ رام کرنے کوئٹہ آئے تھے۔"

اس ضمن میں صحیح بات یہ ہے کہ جنرل محمد ضیاء الحق کی ہدایت پر جو چالیس بلڈوزر اس سال خریدے جا رہے ہیں، ان کے لیے حکومتِ بلوچستان نے سیکرٹری انڈسٹریز کی سرکردگی میں اعلیٰ اختیارات کی ایک "پرچیز کمیٹی" قائم کی ہے جو ضابطے کی تمام کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد گورنر بلوچستان کی رسمی منظوری سے خریداری کرے گی۔ اس معاملے سے نہ تو محکمہ بی اینڈ آر کا بطور محکمہ کوئی تعلق ہے اور نہ مذکورہ سپرنٹنڈنٹ انجینئر "پرچیز کمیٹی" کا ممبر ہے۔

(شکیل احمد کمشنر، منصوبہ بندی و ترقیات حکومت بلوچستان کوئٹہ)

جوش کی خرافات

ہفت روزہ "زندگی" ۲۲ تا ۲۸ دسمبر کے شمارے میں جوش ملیح آبادی کا انٹرویو پڑھا۔ ادارہ "زندگی" کا ایک مستحسن اقدام ہے کہ اس نے ملک دشمن شاعر سے اربابِ اقتدار کو باخبر کیا۔ ریڈیو پاکستان کے اربابِ اختیار جو جی چاہیں عقیدہ رکھیں، یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے، لیکن پاکستان کے مسلمان یہ بات کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ایک طرف تو یہ لوگ بھاری مشاہروں کی وجہ سے ملکی خزانے پر بوجھ بنیں، دوسری طرف اپنے قائد کے بارے میں ایک معقول رقم خرچ کر کے جوش کی خرافات ریکارڈ کریں، ان لوگوں سے سختی سے باز پرس کی جائے۔ (وحیدہ یاسمین، میرپور، آزاد کشمیر)

۱۶ صوبے بنا دیجئے

پاکستان کے سولہ انتظامی صوبے بنائے جانے کے بارے میں بابو قسیم الدین نے ایک اچھی تجویز پیش کی ہے، اس سے صوبائی تعصب ختم ہو جائے گا۔ اس سے اوّل تو اخراجات میں اضافہ نہیں ہوگا، اگر اضافہ ہو بھی تو صوبائی تعصب کے خاتمہ کے لیے جتنا بھی خرچ برداشت کیا جائے، وہ کم ہے۔ اسلئے اگر اس مقصد کے لیے آئین میں ترمیم بھی کرنی پڑے، تو کر دینی چاہیئے۔

(عتیق احمد، ۵۰۹/۸ سیٹلائٹ ٹاؤن، جھنگ)

صوبائیت کا علاج

پاکستان کو صوبائیت کے عفریت سے بچانے کا واحد حل یہ ہے کہ موجودہ چار صوبوں کے بجائے ۱۳ یا ۱۴ صوبے بنائے جائیں۔ "زندگی" کے ۲۲ تا ۲۸ دسمبر کے شمارے میں "نقطۂ نظر" کے عنوان سے بابو قسیم الدین نامی کسی صاحب نے انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف دانشور بلکہ ہم جیسے عام لوگ بھی انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ اس سوچ میں اگر آپ کو بھی معقولیت محسوس ہوتی ہے، تو براہِ کرم اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر فرمائیں۔ یہ کوئی ایسا انتظام نہیں ہے کہ پہلی مرتبہ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان میں صوبوں کی تعداد ہم سے کئی گنا زائد ہے۔ درآنحالیکہ اس کی آبادی پاکستان سے کم ہے۔ یہی صورت نائیجیریا کی ہے۔ اس میں بھی ۱۲ صوبے ہیں اور آبادی پاکستان سے کم ہے۔ آخر یہ انتظامی تبدیلی پاکستان میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ اربابِ حل و عقد اس طرف توجہ فرمائیں۔

(عبدالجبار قریشی، پیر کالونی کراچی)

صدر ضیاء الحق سے تعاون کریں

صدر ضیاء الحق نے نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کا اعلان کر کے قوم کی دیرینہ امنگوں کو پورا کیا ہے۔ پاکستانی عوام نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا جو اسلام کی خاطر اٹھی۔ پاکستانی عوام کی اسلام پسندی کا ثبوت گزشتہ قومی اتحاد کی تحریک میں مل چکا ہے۔ قومی اتحاد سے بعض جماعتوں کی علیحدگی کے نتیجے میں عوام دل برداشتہ اور مایوس ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں صدر ضیاء الحق نے قوم کی امنگوں کو پورا کر کے واقعی قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہم پاکستان کے تمام سیاسی رہنماؤں سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ صدر ضیاء الحق سے اسلامی نظام کے نفاذ میں بھرپور تعاون کا مظاہرہ کریں گے۔ (ایم افضل نور، مسقط، سلطنت اومان)

"دُبئی سپرنگ فیئر"

مڈل ایسٹ کنسٹرکشن نمائش جو ۲۹ اکتوبر سے ۴ نومبر ۱۹۷۸ء تک دُبئی میں منعقد ہوئی۔ اپنی مثال آپ تھی۔ اس نمائش میں مغربی ممالک کی ہی کمپنیوں کے آلات کی نمائش ہوتی رہی، جبکہ ایشیا میں سے صرف جاپان اور کوریا کے اسٹال موجود تھے۔ پاکستان کا نام دیکھنے کی حسرت ہی رہی، لیکن اس میں قصور ہمارے ملک کا بھی نہیں ہے۔ ابھی ہم ایسے آلات پیدا ہی نہیں کر پائے جن کی نمائش ہو سکے، تو شرکت کیونکر ہوتی۔ بہرحال اب ایک موقعہ پھر آرہا ہے، جب پاکستان بھی اس میں شرکت کر سکتا ہے۔ بارہ اپریل سے ۲۲ اپریل ۱۹۷۹ء تک دبئی میں عالمی نمائش برائے موسمِ بہار منعقد ہو رہی ہے۔ اس میں ایشیا کے بھی بہت سے ممالک حصّہ لیں گے۔ ہمارا ملک بھی اس نمائش میں حصّہ لے سکتا ہے اور بہت سی ایسی اشیاء کی نمائش ہو سکتی ہے جن کو ہم بآسانی مشرقِ وسطیٰ برآمد کر سکتے ہیں۔ مزید معلومات "دُبئی سپرنگ فیئر" پوسٹ بکس ۵۵۲، دُبئی، متحدہ عرب امارات سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(بابر سعید ملک، نمائندہ "زندگی" برائے ابوظبی)

مزدور تحریک

۲۸ دسمبر ۷۸ء کا شمارہ زیرِ مطالعہ رہا اور خوشی ہوئی کہ "زندگی" مزدوروں میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ مزدور تحریک کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے "زندگی" کو مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں کہ محنت کشوں کے مسائل اور ان کے حل سے متعلق اور صحیح رہنمائی کے لیے ہر شمارہ میں مضامین شائع کیے جائیں تاکہ ملک کے محنت کش منفی اور مثبت سرگرمیوں سے آگاہ رہیں۔

(محمد شکیل صدیقی، مرکزی پبلسٹی سیکرٹری، پیاسی، کراچی)

پاکستان ریلوے ٹنڈر نوٹس

ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ پاکستان ریلوے ملتان کو ڈویژن ہٰذا کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے ملتان کے مقام پر ایڈیشنل ٹیوب ویل پمپنگ پلانٹ اینڈ ایچ ایس ٹینک .... ۴۰ گیلن کیپیسٹی مہیا کرنے کے ضمن میں پمپ ہاؤس مہیا کرنے اور پائپ لائن فراہم کرنے اور بچھانے کے کام کے لئے کمپوزٹ، شیڈول آف ریٹ ۱۹۷۴ء اور نظرثانی شدہ شیڈول آف ریٹ ۱۹۵۴ء کی اساس پر مجوزہ فارموں پر سربمہر ٹنڈر مطلوب ہیں۔ تخمینہ لاگت ۱۱۴,۰۰۰/- روپے، زرِ امانت ۲۳۰۰/- روپے۔ عرصہ تکمیل ۳ ماہ ہے ــــــ ٹنڈر دستاویزات زرِ امانت کی کیش ڈیپازٹ رسید یا اس کے بدلے بینکرز گارنٹی بانڈ پیش کر کے ۲۰/- روپے ناقابلِ واپسی کی ادائیگی پر ۲۱ جنوری ۱۹۷۹ء کے ۱۰ بجے دن تک حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ ٹنڈر ۲۱ جنوری ۱۹۷۹ء کے ۱/۲ ۱۲ بجے تک وصول کئے اور اسی روز اور اسی وقت حاضر ٹنڈر دہندگان کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ

پاکستان ریلوے ملتان

R10(L) 46-2176

زندگی

ہفت روزہ — لاہور

۵ تا ۱۱ صفر ۱۳۹۹ھ
۵ تا ۱۱ جنوری ۱۹۷۹ء
جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۲

مُدیر منتظم : ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مُدیر : الطاف حسن قریشی

مُدیرانِ مُعاون : ممتاز عامر، رؤف طاہر

قومی سیاست میں بارود بھرنے کا قادیانی منصوبہ — (۱۱)
ایک خوفناک سازش سے پردہ اٹھتا ہے

تعلیم نے حقیقی انقلاب کی منزل پالی — رؤف طاہر — (۶)
تنظیمِ اساتذہ پاکستان کی تعلیمی کانفرنس

سول عہدوں پر فوجی افسروں کی تقرری کیوں ؟ — (۴)
ایک اہم اداریہ

اسلامی ممالک مشترکہ تجارت کے لیے متحد ہو گئے — (۲۹)
کراچی میں اسلامی ممالک کے ایوان ہائے صنعت و تجارت کی کانفرنس کی مکمل رپورٹ ، اکرام غازی نے لکھی

قائد کے نظریات کی خوشبو عام ہو رہی ہے — (۲۲)
بہاول پور کی ایک باوقار تقریب ، رپورٹ ایاز قریشی

مُسلم لیگ کی بولی کراؤ — ممتاز عامر کا فکر انگیز کالم — (۲۸)

قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عمل جاری ہے — (۳۵)
لاہور میں عالمی تنظیم ماہرین قانون اسلامی کا مذاکرہ

اصلاح معاشرہ کی ۸ قابل عمل تجاویز — میاں عبدالرشید — (۴۱)

شجرِ سیاست سے ایک اور شاخ پھوٹی — (۳۷)
آغا اشرف کی تیکھی تحریر

تھانیدار کی مدد سے پیپلز پارٹی کی غنڈہ گردی — (۳۳)

سیمنٹ کی تقسیم پرچون فروشوں کے حوالے کی جائے — (۲۴)

ہمارے نمائندے

اسلام آباد : سید سبطِ احمد
: فیاض شاہد

آزاد کشمیر / راولپنڈی : طارق محمود طارق

فیصل آباد : محی الدین احمد
رحمٰن بلڈنگ، کچہری بازار، فون ۳۱۲۸۸

گوجرانوالہ : بذل احمد
۵ گوبند گڑھ، اسلامیہ کالج روڈ

کراچی : اکرام غازی ۴۳۵۹۳۳
: خالد خلد ۶۱۶۹۸۹

صوبہ سرحد : عبدالہادی احمد
۴۔میونسپل فلیٹس۔ حاجی کیمپ پشاور

صوبہ بلوچستان : مسلم قریشی ، کوئٹہ

اندرونِ سندھ

حیدر آباد : محمد موسیٰ بھٹو
باب الاسلام پبلی کیشنز، ٹھنڈی سڑک

لاڑکانہ : جی ایچ حیدری
بربھات پبلی کیشنز ، بندر روڈ

سانگھڑ : عظمت اللہ عباسی

تھرپارکر : ارباب عبدالمالک انیس

*

مُستقل کالم نگار

خانی خاں، صادق حسین ،

آغا اشرف ، عظیم سرور ،

نثار الحق ،

بیرونِ مُلک نمائندے

ریاض : پروفیسر عثمان غنی

کویت : سید محمد رضوی

دُبئی : منیر احمد خلیلی
پوسٹ بکس نمبر ۶۲۱

ابوظہبی : سکندر ملک
پوسٹ بکس نمبر ۴۴۱۳۷
: بابر سعید ملک
پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۷ — العین

قطر : فضل ہادی سواتی
پوسٹ بکس ۲۱۲ - دوحہ -

*

کراچی آفس : اشتہارات : مشتاق احمد
۱۸-ڈی بلاک ۲ - شاہراہِ قائدین
بالمقابل پوسٹ آفس، پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹
فون : ۴۳۶۳۱۴

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی پرنٹر پبلشر نے اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز سرکلر روڈ لاہور سے چھپوا کر ۲۱-ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور سے شائع کیا

صحافت ایک بہت بڑی قوت ہے، جو فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور نقصان بھی
اگر یہ ٹھیک نہج پر ہو تو رائے عامہ کی رہنمائی بھی کر سکتی ہے۔

(قائدِ اعظمؒ)

سِول عہدوں پر فوجی افسروں کی تقرری کیوں؟

لاہور میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل (ریٹائرڈ) ممتاز علی خان نے ۳۰ر دسمبر کو جناح ہال میں نظامِ مصطفےٰؐ کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہ دے کر جس بے تدبیری اور عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا ہے، اس سے نہ صرف مارشل لاء حکومت کے حامی قومی اتحاد کے امیج کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا، بلکہ خود مارشل لاء حکومت بھی اس کے بُرے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ۲۹ر دسمبر کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ پاکستان علماء کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ نظامِ مصطفےٰؐ کانفرنس کا دُوسرا اجلاس ۳۰ر دسمبر کو جناح ہال میں منعقد ہو گا؛ اگرچہ اسی روز اس امر کی خبریں بھی سُننے میں آ رہی تھیں کہ لاہور کارپوریشن نے اجلاس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے، لیکن علماء کونسل کے چند جوشیلے مقررین نے اعلان کیا کہ یہ اجلاس ہر قیمت پر جناح ہال میں ہی ہو گا؛ حتیٰ کہ خاکسار تحریک کے سربراہ اور قومی اتحاد کے رُکن محمد اشرف خان نے یہ اعلان کر کے کہ "یہ ہمارا پہلا مورچہ ہو گا" اسے قومی اتحاد کے لیے وقار کا مسئلہ بنا دیا۔ دُوسرے روز اس جلسے میں شرکت کے لیے جب بہت سے لوگ جناح ہال پہنچے، تو انہیں یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ ناظم بلدیہ نے بھی اس جلسہ کے انعقاد کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے اور وہ کسی قیمت پر بھی ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

اس نازک موقع پر عوام کے بپھرے ہوئے جذبات کو اگر قومی اتحاد کے عاقبت اندیش لیڈر ٹھنڈا نہ کرتے اور وہ بھی جلسہ کے انعقاد کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتے، تو ہولناک نتائج کی پیشگوئی کرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن مُفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور میاں طفیل محمد وغیرہ نے سُوجھ بُوجھ سے کام لیا اور انتہا پسند کارکنوں کے جذباتی نعروں سے بے پروا ہو کر عدم تصادم کی پالیسی اختیار کر کے وقتی طور پر معاملے کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا؛ اگرچہ اس فیصلے پر انہیں سخت ناپسندیدہ باتیں بھی سُننا پڑیں اور قومی اتحاد کی بے بسی اور بے اختیاری کے طعنے بھی سُننے پڑے، لیکن مُلک کی موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے انہوں نے محاذ آرائی سے اجتناب ہی بہتر سمجھا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ معاملہ تصادم کی حد تک پہنچنا ہی نہیں چاہیئے تھا، بلکہ شروع ہی سے افہام و تفہیم کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اگر ناظم بلدیہ نے اس ہال میں بلدیہ کے اپنے اجلاس کے سوا کسی بھی قسم کی دُوسری تقریب کی اجازت نہ دینے کا باضابطہ فیصلہ کر لیا تھا، تو اخبارات و جرائد کے ذریعے اس فیصلے کی تشہیر ضروری تھی تاکہ کوئی بھی سیاسی یا غیر سیاسی ادارہ اس ہال میں تقریب منعقد کرنے کا پروگرام نہ بناتا، لیکن اس بے خبری کی بناء پر اگر ایک غیر سیاسی تنظیم نے جناح ہال میں جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام بنا ہی لیا تھا، تو اسے کسی مناسب طریقے سے بدمزگی پر منتج ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ اس اجلاس کا اہتمام علماء کونسل نے کیا تھا اور اس کا مقصد بھی صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو ان اقدامات پر ہدیۂ تبریک پیش کرنا تھا جو وہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کانفرنس میں اسلامی مشاورتی کونسل کے لیے کارآمد تجاویز بھی مرتب کرنا تھیں، لیکن ایڈمنسٹر بلدیہ نے عوام کے پیسے سے بنے ہوئے ہال کو عوام پر بند کر کے انتظامی صلاحیتوں کا کوئی اچھا ثبوت پیش نہیں کیا۔ اس اجلاس میں قومی اتحاد کے سربراہ اور بعض وفاقی وزیر بھی شامل ہونے والے تھے، لیکن جب ان کے لیے بھی جناح ہال کے دروازے نہ کُھل سکے، تو عوام یہ نعرہ لگانے میں کسی حد تک حق بجانب تھے کہ اب قومی اتحاد کو فوری طور پر حکومت سے الگ ہو جانا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاید مارشل لاء حکام کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ سیاسی جماعتوں کو اُن کے ساتھ تعاون کرنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ ان جماعتوں کے مخالفین ہی نہیں؛ بلکہ بعض حامی بھی اُن کے اس فیصلے پر مسلسل تنقید کر رہے ہیں اور اپنے لیڈروں پر اس تعاون سے دست کش ہونے پر زور دے رہے ہیں، لیکن اگر ان سیاسی جماعتوں نے مُلک و ملت کے وسیع تر مفاد میں اس کڑوی گولی کو نِگلنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، تو اس فیصلے کی پذیرائی شکرگزارانہ طریقے سے ہونی چاہیئے تھی، مگر اس کے برخلاف صورتِ حال کچھ ایسی نظر آتی ہے جیسے دوسری سطح کے بعض فوجی افسر اسے سیاسی جماعتوں پر حکومت کا احسان قرار دے رہے ہوں اور وزیروں کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہوں۔

حکومت کو اس بات کا احساس ہونا چاہیئے تھا کہ اس زمانے میں کاروبار حکومت محض اختیار و اقتدار کے ڈنڈے سے نہیں چل سکتا، بلکہ حکومت کو بھی عوام کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے صرف قومی اتحاد کے ذریعے حاصل ہے، اگر قومی اتحاد کا سہارا بھی کمزور پڑ جائے یا عوام میں اس کی وقعت باقی نہ رہے، تو اس سے بالآخر حکومت ہی کو نقصان پہنچے گا۔ قومی اتحاد کے مخالف تو پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے وزراء بالکل بے اختیار اور بے بس ہیں اور انہیں حکومت میں محض دکھاوے کے لیے گلدستوں کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اب اگر قومی اتحاد کے حامی بھی یہ محسوس کرنے لگیں کہ "ایکٹو" ہی نہیں، بلکہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی انہیں "ایاز قدرے خود بشناس" کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے، تو اس سے نہ صرف ایاز کا وقار مجروح ہو گا، بلکہ محمود کے وقار میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔

یہ محض سوئے اتفاق نہیں کہ اس واقعہ میں ملوث افسر جس کی ناعاقبت اندیشی اور انانیت نے قومی اتحاد اور حکومت دونوں کے لیے خواہ مخواہ کی مشکلات کھڑی کر دی ہیں، ایک سابقہ فوجی افسر ہے بلکہ عوام کچھ عرصے سے محسوس کرنے لگے ہیں کہ اکثر و بیشتر سول عہدوں پر اب "ایکٹو" اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کی تقرری ہو رہی ہے۔ سول محکموں میں فوج کا اس قدر دخل عمل دونوں کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں ہے، بلکہ اس سے عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات بڑھنے لگے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے زیادہ تر افسر ریٹائرڈ فوجی ہیں اور سول شعبے میں ان کی منتقلی سے فوج کی مجموعی کارکردگی متاثر نہیں ہوتی، لیکن یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس سے سول انتظامیہ اور عوام میں منفی ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے سبھی ممالک میں غیر معمولی انتظامی صلاحیت رکھنے والے فوجی افسروں سے ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد سول محکموں میں استفادہ کیا جاتا ہے لیکن یہ سب کچھ ایک طے شدہ پالیسی کے تحت کیا جاتا ہے اور فوجی افسروں کی تعداد ایک خاص تناسب سے بڑھنے نہیں دی جاتی۔ خود وطنِ عزیز میں بھی شروع سے ہی فوجی افسر سول محکموں میں آتے رہے ہیں، لیکن سول حکومت کے زمانے میں جو پالیسی سودمند ثابت ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ فوجی حکومت کے دوران بھی مفید ثابت ہو، کیونکہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ فوجی حکومت کے دوران سول پوسٹوں پر فائز فوجی افسران کی کارکردگی پر زیادہ کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ فوج سے اپنے سابقہ تعلق کی بنا پر ان میں "سیاں بھئے کوتوال" کا احساس خود فوجی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں لاکھ احتیاط کے باوجود فوجی حکومت دوست پروری اور اقربا نوازی کے الزامات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ درست ہے کہ فوجی حکمرانوں کے لیے طاقت کے اصل سرچشمے کو مطمئن رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور جنرل ضیاء الحق کے بقول یہی لوگ ان کا اصل حلقہ انتخاب (CONSTITUENCY) ہیں، لیکن فوجی حکومت رائے عامہ سے بے نیاز رہ کر زیادہ دیر گزارا نہیں کر سکتی، اس لیے ان دونوں انتہاؤں میں توازن اور اعتدال کی پالیسی ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر فوجی حکومت کا حقیقی مطمحِ نظر واقعی یہی ہے کہ وہ ضرورت سے ایک دن بھی زیادہ اقتدار پر قابض نہیں رہنا چاہتی اور جلد از جلد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے پھیلاؤ کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مختلف سفارتی اور سول عہدوں کے علاوہ اگر خود مختار کارپوریشنوں پر بھی فوجی افسر قابض ہو جائیں، تو ایک ایسا پریشر گروپ وجود میں آ سکتا ہے جو انتقالِ اقتدار کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ جنرل ضیاء اپنے انتقالِ اقتدار کے دعوے میں مخلص ہیں اور وہ سیاسی جماعتوں کے تعاون سے جلد از جلد انتخابات کی راہ ہموار کر رہے ہیں، لیکن انہیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا ہر اقدام عوام کے لیے یقین افزاء ثابت ہو۔ سول محکموں میں فوجی افسروں کی بھرمار اور سفارتی عہدوں پر فوجی افسروں کا تقرر یقیناً اس بارے میں ممد ثابت نہیں ہوتا اور اس سے عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ سول عہدوں پر فائز فوجی افسروں کی کارگزاری سے عوام اپنے حالات میں اگر واقعی کچھ فرق محسوس کریں تو وہ ان کے بڑھتے ہوئے تناسب پر اس قدر ناک بھوں نہ چڑھائیں، لیکن اگر فوجی افسر بھی بیوروکریسی کی کانِ نمک میں داخل ہو کر انہی کی طرح، بلکہ ان سے بڑھ کر نمک ثابت ہونے لگیں اور سول تربیت کے فقدان کے باعث سول افسروں سے بھی گئے گزرے ثابت ہوں، تو بے بس عوام کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ ذاتی مثالیں دینا بدذوقی شمار ہوتا ہے، لیکن ہمیں بتایا جائے کہ مرکزی سیکرٹری اطلاعات جوشش جیسے وطن دشمن اور اسلام بیزار سانپ کو خصوصی مراعات کا دودھ کیوں پلاتے رہے؟ یا انہوں نے نظریۂ پاکستان کے مخالف عناصر سے ریڈیو، ٹی وی کی کس قدر تطہیر کی ہے؟ اسی طرح پنجاب کے سیکرٹری تعلیم بھی ایک ایکٹو فوجی افسر ہیں، ان کی آمد سے محکمۂ تعلیم میں کون سا انقلاب آ گیا ہے؟ تعلیم گاہوں سے نظریۂ پاکستان کے کتنے دشمن نکالے گئے ہیں؟ اور تعلیم کا معیار کتنے ڈگری بلند ہوا ہے؟ یہی حال محکمہ صحت کا ہے، جس کے سیکرٹری بھی ایک فوجی افسر ہیں اور یہی حال لاہور کارپوریشن کا ہے، جس کے ناظم بلدیہ کی "حسین کارکردگی" کا اندازہ جناح ہال کے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس کارکردگی کے حامل فوجی افسروں کو اگر آپ دھڑا دھڑ سول پوسٹوں پر متعین کرتے رہے تو اس سے عوام کا وہ اعتماد لازماً مجروح ہو گا جو انہیں اپنی محبتِ وطن افواج پر ہے اور جس کا مظاہرہ وہ "پاک فوج کو سلام" کے بینر لکھ لکھ کر کرتے رہتے ہیں۔

ہم جنرل ضیاء الحق سے درخواست کریں گے کہ اول، تو وہ اپنے اس "حلقہ انتخاب" کو قابو میں رکھیں اور سول پوسٹوں پر فوجی افسروں کا تقرر بند کر دیں اور اگر یہ ناگزیر ہو، تو اسے ایک طے شدہ تناسب سے بڑھنے کا موقع نہ دیں۔ دوسرے صرف انہی افسروں کو سول پوسٹوں پر مقرر کریں جو غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں اور جن کی آمد پر عوام محسوس کریں کہ سول اور فوجی افسر میں واقعی فرق ہوتا ہے۔ تیسرے سول پوسٹوں پر ان کی تقرری سے پہلے ان کی تربیت کے لئے ایک شارٹ کورس کا اہتمام کیا جائے۔

ہم قومی اتحاد سے بھی اپیل کریں گے کہ اس واقعہ سے ان کے وقار کو جو دھچکا لگا ہے، وہ اس کی تلافی کی کوشش کریں۔ تصادم کی پالیسی سے گریز کر کے انہوں نے جس بالغ نظری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اس کے لئے لائقِ تحسین ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لینا چھوٹے لوگوں کا کام ہے اور ہم سیاسی جماعتوں کے قائدین کو اس سے بالا سمجھتے ہیں، لیکن اپنی عزت اور وقار کی حفاظت جان سے بھی زیادہ ضروری ہوتی ہے اور ایک سیاسی لیڈر کے لئے، تو یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے سیاسی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

رؤف طاہر

تعلیم نے حقیقی انقلاب کی منزل پالی

تنظیمِ اساتذہ پاکستان کے زیرِ اہتمام

تعلیمی کانفرنس کی مکمل رُوداد

جامعہ پنجاب کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوتے اربابِ علم جمع تھے۔ فضا روشنیوں سے معمور اور ماحول متانت اور وقار سے لبریز تھا۔ آڈیٹوریم کی وسعتیں تمام حاضرین کو اپنے دامن میں جگہ دینے سے قاصر تھیں، چنانچہ جنہیں آڈیٹوریم کے اندر جگہ نہ مل سکی، ان کے لئے ملحقہ کمروں میں بیٹھ کر کارروائی سے مستفید ہونے کا اہتمام کر دیا گیا تھا اور وہ ٹی، وی کے شارٹ سرکٹ پر اس قدآور علمی تقریب کی کارروائی سے استفادہ کر رہے تھے۔

یہ تنظیمِ اساتذہ پاکستان کے زیرِ اہتمام کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا اور مندوبین میں بلوچ بھی تھے اور پختون بھی "اندرونِ سندھ سے آئے ہوتے اساتذہ بھی تھے اور پنجاب اور آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں سے آنے والے بھی۔ ان میں پرائمری سکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک کے اساتذہ شامل تھے۔ ہیڈ ماسٹر بھی تھے، پرنسپل بھی، لیکچرار بھی اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی۔ یہ سب لوگ یہاں علاقوں اور زبانوں کے تعصبات، گریڈوں اور سکیلوں کے امتیازات سے بالاتر ہو کر صرف اسلام اور پاکستان کی خدمت کے جذبے سے جمع ہوئے تھے۔ سرد موسم اور طویل سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر کے آنے والے یہ اساتذہ اپنی تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ منوانے آئے تھے، نہ کسی ٹی اے، ڈی، اے کا لالچ انہیں یہاں لایا تھا۔ دُور دراز مقامات سے، اپنی جیب سے بھاری کرائے ادا کر کے، آنے والے یہ لوگ اس احساس کے ساتھ یہاں جمع ہوتے تھے کہ ہم ایک نظریاتی مملکت کے استاد ہیں، ہمیں ایک نظریاتی ریاست کے لئے نظریاتی شہری تیار کرنا ہیں اور اس اجتماع کا مقصد اس مقدس، عظیم اور پاکیزہ مشن کی راہ میں حائل مشکلات اور دشواریوں کا جائزہ لینا، اور انہیں حل کرنے کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق جنہیں اس کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا، جناب بومدین کے جنازے میں شرکت کے لئے الجزائر تشریف لے گئے تھے اور اس کانفرنس میں ان کی نمائندگی کے لئے گورنر پنجاب جناب جنرل سوار خاں آئے تھے۔ سٹیج پر ان کے ہمراہ جناب پروفیسر خورشید احمد، صوبائی مشیر تعلیم امتیاز شیخ اور شیخ الجامعہ جناب خیرات ابن رسا تشریف فرما تھے۔ تنظیمِ اساتذہ پاکستان کے صدر حافظ وحید اللہ خاں نے خطبۂ استقبالیہ میں کابینہ کے حالیہ اجلاس میں دو خواتین یونیورسٹیوں کے قیام اور اُردو کو ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کے فیصلوں کا خیر مقدم کرنے کے بعد کہا:

"جنابِ والا! اصول اور مقصد سے مزین نظامِ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسے اساتذہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے، جو اس اصول اور مقصد کے ساتھ وفادارانہ رشتہ رکھتے ہوں، جو اسلامی ریاست اور مسلمان معاشرے کے مشن کی دیانتداری سے خدمت انجام دیں اس لئے اساتذہ کے انتخاب کے وقت قومی، اسلامی اور علمی اقدار کا پوری طرح جائزہ لیا جائے اور اساتذہ کی تربیت میں بھی ان اقدار کو اجاگر کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جائے"۔ اس موقع پر انہوں نے اس منصوبے کا بھی ذکر کیا جسے تنظیمِ اساتذہ پاکستان نے اساتذہ کی بہترین تربیت اور کارکردگی کے لئے خاص طور پر تیار کیا ہے:-

۱ - اسلامی نظام کی تشکیلِ جدید کے مقصد کو سامنے رکھ کر علمی اور تحقیقی کام کے لئے ایک اکیڈیمی کا قیام

۲ - ایک ٹریننگ کالج کا قیام جس میں اسلامی ذہن و کردار رکھنے والے اساتذہ تیار کیے جائیں۔

۳ - نئے تعلیمی نظام کو کامیاب بنانے کے لئے چند معیاری تعلیمی اداروں کا قیام۔

خطبہ استقبالیہ جاری تھا کہ میاں طفیل محمد صاحب کے ہمراہ دو معزز مہمان تشریف لائے۔ ان میں سے ایک، کوٹ پتلون پہنے ہوتے اور دوسرے نے مخصوص عربی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد سٹیج سے نیچے آئے اور آگے بڑھ کر مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مائک پر سے اعلان ہوا ——— "جنابِ محمد قطب اور سعد الرشید تشریف لائے ہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی فضا "سید قطب شہید زندہ باد" اور اسلامی انقلاب کے نعروں سے گونج اٹھی۔ نعرے دیر تک بلند ہوتے رہے۔ حاضرین بے پایاں جوش و خروش کے ساتھ ان ذی وقار مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے ——— بے محابا اور والہانہ خیر مقدم جس میں خوشی، مسرت، احترام، محبت اور عقیدت، سب کچھ شامل تھا کوٹ پتلون میں ملبوس محمد قطب تھے اور عربی لباس پہنے ہوتے جناب سعد الرشید، پروفیسر خورشید احمد، مہمانوں کو ساتھ لے کر سٹیج پر پہنچے جناب سوار خاں نے بھی اپنی نشست سے اُٹھ کر مہمانانِ ذی احتشام کا استقبال کیا۔ جنابِ محمد قطب کے نشست پر بیٹھتے ہی ٹی، وی اور اخبارات کے فوٹو گرافر ان کی طرف لپکے، کیمروں کی روشنیاں ان کے ان کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ایک وقار آمیز، خوبصورت مسکراہٹ ان کے لبوں پر تیر رہی تھی اور پھر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں جناب محمد قطب کے بڑے بھائی سید قطب شہید کی تصویر ابھر آئی۔ سزائے موت سننے کے بعد، سوئے مقتل جاتے ہوتے ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، لازوال مسکراہٹ، جو ان نیک بندوں کا مقدر ہوتی ہے، جو موت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس احساس سے سرشار ہوتے ہیں کہ بندہ اپنے رب کے حضور جا رہا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد "نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید" کے موضوع پر خطاب کر رہے ہیں۔

تعلیمی کانفرنس

"سید قطب شہید کی وہ مسکراہٹ اہل مصر پر قرض ہے"، میرے ذہن کے کسی گوشے میں خیال ابھرا اور اگلے ہی لمحے ذہن کے دوسرے گوشے سے جواب آیا، "مصر میں اٹھتے ہوئے اسلامی جذبے اور حکومت مصر کی جانب سے کیے جانے والے مختلف اسلامی اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اہل مصر نے یہ قرض چکانے کا فیصلہ کر لیا ہے"

۲۸ دسمبر کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ مؤذن خدا کی کبریائی کا اعلان کر رہا تھا، لوگوں کو کائنات کے رب کے حضور سربسجود ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ جناب پروفیسر خورشید احمد نے "نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید اور اس کے مسائل" پر سیر حاصل گفتگو کی اور پھر جنرل سوار خاں خطبۂ صدارت کے لئے مائک پر آئے ———— "یہ مسلمانوں کا ملک ہے، اسلام کے لئے بنا ہے اور یہاں اسلامی نظام تعلیم ہی نافذ ہونا چاہیئے، یہ امر واضح ہے کہ لادین افراد کو اس نظریاتی مملکت کے تعلیمی اداروں میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تعلیمی پالیسی کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اساتذہ کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آج کے نظریاتی دور میں جنگیں زمینوں، سمندروں اور فضاؤں کے بجائے ذہنوں میں لڑی جاتی ہیں اور ۱۹۷۱ء میں ہم اس کا عملی مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کانفرنس کے نتیجے میں مفید سفارشات اور عملی تجاویز سامنے آئیں گی۔ ہمیں ان سفارشات کا انتظار رہے گا۔"

مطالعاتی نشستیں

تنظیم اساتذہ کی یہ کانفرنس تین دن کے بجائے چار دنوں پر پھیل گئی تھی۔ جناب ضیاء الحق نے ۲۷ دسمبر کو صبح دس بجے اس کا افتتاح کرنا تھا۔ پھر کچھ اہم تر مصروفیات کے باعث صدر مملکت نے ۲۸ دسمبر کی سہ پہر کا وقت دے دیا۔ مندوبین میں سے بیشتر ۲۶ دسمبر کی صبح ہی کو لاہور پہنچ گئے تھے اور ۲۷ دسمبر کی صبح تک رجسٹرڈ مندوبین کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد ہو چکی تھی۔ کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح ایک دن کے لیے ملتوی ہوا، تو منتظمین نے اس وقت کو مطالعاتی نشستوں (سٹڈی گروپس) کے لیے صرف کرنا پروگرام بنایا، چنانچہ بیس اہم تعلیمی موضوعات پر سٹڈی گروپس تشکیل دیے گئے:

۱۔ ابتدائی تعلیم
۲۔ ثانوی تعلیم
۳۔ اعلیٰ تعلیم
۴۔ ٹیکنیکل تعلیم
۵۔ نصاب تعلیم اور اسلامی نظریۂ حیات
۶۔ عمرانی علوم کی تعلیم
۷۔ سائنس کی تعلیم
۸۔ ریاضی کی تعلیم
۹۔ زبانوں کی تعلیم
۱۰۔ تربیت اساتذہ
۱۱۔ مسائل طلبہ
۱۲۔ نظام امتحانات
۱۳۔ ناخواندگی کا مسئلہ
۱۴۔ دینی مدارس کی تعلیم
۱۵۔ نظام تعلیم میں لائبریری کا کردار
۱۶۔ درسی کتب کی تدوین و اشاعت
۱۷۔ صحت اور تعلیم جسمانی
۱۸۔ تعلیمی انتظامیات
۱۹۔ اسلامی نظریۂ حیات کی تعلیم
۲۰۔ تعلیمی منصوبہ بندی

یہ تعلیمی کانفرنس ۳۰ دسمبر کی سہ پہر تک جاری رہی۔ کُل پانچ اجلاس ہوئے۔ ۲۸ دسمبر کو افتتاحی اجلاس کے بعد رات ½۷ بجے دوسرا اجلاس منعقد ہوا، یہ ایک مجلس مذاکرہ تھی جس کے مہمانِ خصوصی وزیر اطلاعات و نشریات جناب محمود اعظم فاروقی تھے۔

"نظام تعلیم میں ابلاغِ عامہ کا کردار" کے موضوع پر جناب صلاح الدین (مدیر "جسارت")، جناب مجیب الرحمٰن شامی (مدیر "بادبان")، جناب ضیاء الاسلام انصاری (مدیر "مشرق" لاہور) جناب نعیم صدیقی (مدیر "سیارہ") اور جناب سرور منیر راؤ (پاکستان ٹیلی ویژن لاہور) نے اظہار خیال کیا۔

تیسرے اجلاس (۲۹ دسمبر کی صبح) کے مہمانِ خصوصی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب شیخ انوار الحق تھے۔ اس اجلاس کی صدارت جنرل سوار خان کو کرنا تھی، لیکن وہ سعودی عرب سے تشریف لانے والے جناب سعد الرشید کے حق میں "دستبردار" ہو گئے۔ سعد الرشید صاحب

سید مودودی نے فرمایا

اس موقع پر اپنی بیماری کی وجہ سے کوئی مفصل تقریر تو نہیں کر سکتا، بس چند باتیں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایک حقیقی اُستاد کوئی پیشہ ور کتابیں پڑھانے والا آدمی نہیں ہوتا، وہ درحقیقت ایک مشنری ہوتا ہے۔ حقیقی استاد وہی ہے جس کی زندگی کا یہ مشن ہو کہ جو علم ہمیں اپنے اگلوں سے پہنچا ہے، جو تہذیب ہمیں اپنے اگلوں سے ملی ہے، جو عقائد، افکار، عادات اور خصائل ہمیں اگلی نسلوں سے ملے ہیں، ان کو ہم آگے آنے والی نسل تک اچھی طرح سے صاف کر کے صحیح شکل میں پہنچائیں۔ کوئی کھوٹ اُن کے ساتھ نہ ملنے پائے اور نئی نسل بھی اُسی راستے پر چلے، جس پر ہماری پچھلی اُمت چلی آ رہی تھی۔ اگر مشنری جذبے سے کوئی شخص معلم کا کام نہیں کرتا، تو وہ مزدور ہے، ملازم ہے، استاد نہیں ہے۔ یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھئے کہ معلم مجسم تعلیم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ وہ معلم بنا کر بھیجے گئے تھے اور وہ صرف زبان ہی سے تعلیم نہیں دیتے تھے۔ اُن کی رفتار، گفتار، نشست و برخاست، اُن کی زندگی کا ہر فعل، غرض سب کچھ تعلیم تھی۔ اسی طرح ایک مُسلمان معلم بھی حقیقت میں مجسم تعلیم ہوتا ہے۔

دوسری بات میں مختصراً آپ سے یہ عرض کروں گا کہ ایک مسلمان معلم جو سچے دل سے اللہ کے دین پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے دل و دماغ میں اللہ کا دین رچ بس گیا ہو، وہ تعلیم دینے کے لیے جاتا ہے، تو اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا کہ نظام تعلیم کیا ہے اور کتابیں کیا سکھا رہی ہیں۔ اگر اُستاد اپنا کوئی نظریہ رکھتا ہے، سچے دل کے ساتھ اس پر ایمان رکھتا ہے، تو وہ ہر مضمون کے اندر اپنے عقیدے کو داخل کر دیگا۔ کتابوں میں جو چیز اسلام کے خلاف ہو گی، اس پر وہ تنقید کرے گا اور جو چیز اسلام کے مطابق ہو گی، اس کو زیادہ وہ طالب علم کے ذہن نشین کرے گا۔ خالص کافرانہ کتابیں پڑھا کر بھی وہ ایمان سکھا سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کمیونزم کی تعلیم نہیں دی جاتی، وہاں کمیونسٹ استادوں ہی نے تو کمیونسٹ طلباء پیدا کر دیئے۔ خود اپنے ملک میں دیکھ لیجئے۔ یہاں شروع ہی سے غیر اسلامی نظام تعلیم رائج ہے، لیکن اس کے باوجود کالجوں اور یونیورسٹیوں سے جہاں منکرِ خدا اور منکرِ آخرت افراد تیار ہو کر نکلے، وہاں وہ لوگ بھی ایک بڑی تعداد میں نکلے جو نہ صرف ایمان رکھتے ہیں، بلکہ اللہ کے دین کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

تیسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس جدوجہد کو مسلسل جاری رکھئے کہ جو استاد بھی اس مُلک کے اندر موجود ہے اور کچھ بھی اسلامی جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے، ان کو اپنی تنظیم میں شامل کرتے چلے جائیے۔ یہاں تک کہ پُورے پاکستان میں صرف دو ہی قسم کے استاد باقی رہ جائیں، ایک منکرِ اسلام اور دوسرے اسلام پر ایمان رکھنے والے۔ اکثریت خدا کے فضل سے اب بھی مسلمان ہے اور اسلام پر ایمان رکھتی ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ ایمان منظم ہو۔ طاقت تنظیم سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایک آدمی اپنی جگہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایمان اور اخلاق کو اگر آپ منظم کر دیں اور پھر وہ ایک منصوبے کے ساتھ طلبہ کے اخلاق اور کردار، ان کے خیالات و افکار کو درست کرنا شروع کر دیں، تو اس کے بعد اگر حکومت بدکردار اور بے دین استادوں کو تعلیمی اداروں سے نہ بھی نکالے گی، تب بھی ان کی حیثیت محض اچھوت کی رہ جائیگی۔ طالب علم ان سے دور دور رہیں گے، وہ ان کا کوئی اثر قبول نہیں کریں گے۔ ان کو خود محسوس ہو جائے گا کہ اب ہم یہاں وہ حیثیت رکھتے ہیں، جو معدے میں کونین کی ہوتی ہے کہ معدہ اس کو نکالنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

تعلیمی کانفرنس کے مندوبین کے صوبہ وار اعداد و شمار

	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان
پرائمری، مڈل سکول ٹیچر	۲۰۴	۲۴	۱۴۶	۵۴
سیکنڈری سکول ٹیچر	۱۸۶	۳۰	۶۵	۲۶
ہیڈ ماسٹر	۲۶	۱۲	۶	۳
کالج لیکچرر، پروفیسر	۱۳۴	۴۹	۸	۴
پرنسپل	۵	۱	-	-
یونیورسٹی پروفیسر	۵۰	۵	۱۲	۱
کل تعداد	۶۰۵	۱۲۱	۲۳۷	۸۸

ان ۱۰۵۱ مندوبین کے علاوہ آٹھ سو غیر رہائشی مندوبین اور قریباً چھ سو دیگر مدعوئین کانفرنس میں شریک ہوئے

جامعہ ملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں کلیۃ الشریعہ کے سربراہ ہیں۔ اس اجلاس میں جناب صلاح الدین نے "قومی یک جہتی میں زبان کا کردار"، جناب نعیم صدیقی نے "نظامِ تعلیم میں مطلوبہ تبدیلی کیسے لائی جا سکتی ہے"، جناب خالد اسحاق نے "نظامِ تعلیم میں تحقیق کا مقام" اور ڈاکٹر انوار صدیقی نے "اعلیٰ تعلیم کے انتظامی مسائل" جیسے اہم موضوعات پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا۔

جناب جسٹس انوار الحق نے جو اس وقت قائم مقام صدرِ مملکت بھی تھے، اپنے خطبے میں فرمایا:

"پاکستان جان و مال اور عزت و آبرو کی بے پناہ قربانیوں کے بعد معرضِ وجود میں آیا تھا، اس کے لیے ان مسلمانوں نے بھی قربانیاں دیں، جنہیں یقین تھا کہ پاکستان بننے کے بعد بھی، ان کے علاقے ہندوستان ہی کا حصہ رہیں گے اور انہیں اقلیت بن کر متعصب ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔ گزشتہ سال اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے تاریخ کی ایک بے مثال تحریک چلی۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ ان عظیم الشان قربانیوں کے باعث، ایک مدتِ دراز کے بعد یہاں اسلامی نظام کے لیے فضا سازگار ہوئی ہے۔ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا، تو تاریخ صدیوں تک ہمیں معاف نہیں کرے گی۔"

جنابِ سعد الرشید نے اپنے خطبۂ صدارت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت، موجودہ بین الاقوامی حالات میں پاکستان کی جغرافیائی اہمیت، اسلامی نظریاتی ریاست میں اساتذہ کی ذمہ داریاں اور عالمِ اسلام کو درپیش تعلیمی مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔

چوتھا اجلاس میجر آفتاب حسن (سابق پرنسپل ٹنڈو الہ یار کالج حیدر آباد) کے زیرِ صدارت ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اقبال ظفر (ادارۂ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب) نے "ثانوی مدارس میں معاشرتی علوم کا نصاب"۔ ملک محمد حسین سیکرٹری تنظیم اساتذہ صوبہ پنجاب نے "تعلیمی منصوبہ بندی برائے تبدیلیٔ معاشرت"، پروفیسر عنایت علی خاں (مسلم کالج حیدر آباد) نے "نظامِ امتحان اور معیارِ تعلیم" اور ڈاکٹر شمس الدین (صدر شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی) نے "قومی ثقافت میں تعلیم کی اہمیت" پر مقالے پڑھے۔

اختتامی اجلاس (۳۰۔ دسمبر کی صبح) کے مہمانِ خصوصی جناب محمد قطب تھے، جب کہ کرسیٔ صدارت پر جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر جناب خیرات ابنِ رسا فروکش تھے۔ جنابِ قطب نے اس موقع پر ڈیڑھ گھنٹہ کا بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اور وہ کردار کے علاوہ گفتار کے بھی غازی نکلے۔ ان کا دھیما اور فکر انگیز انداز کائناتِ قلب و دماغ کو مسخر کرتا چلا گیا۔ عربیٔ مبین میں ان کے فاضلانہ خیالات کو جنابِ خلیل حامدی اردو کے پیکر میں ڈھال رہے تھے۔

کانفرنس اختتام پذیر ہوئی، تو اہلِ علم اس دور کے سب سے بڑے صاحبِ فضل و دانش کے ہاں حاضر ہوئے۔ ۵ اے ذیلدار پارک، سید مودودی کا مسکن، جہاں سے دورِ حاضر کی تمام اسلامی تحریکیں اور اسلامی انقلاب کے کارکن رہنمائی حاصل کرتے ہیں، صدی کا انسان، اپنی تمام توانائیوں کو اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں کھپا دینے کے بعد اب علالت کے ہاتھوں نڈھال ہے، لیکن اسلامی انقلاب کے اس کاروانِ علم و دانش کو دیکھ کر جنابِ سید کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ادھر سیدِ محترم کا خطاب ختم ہوتا ہے، ادھر ۳۰۔ دسمبر کا سورج غروب ہو رہا ہے، اربابِ شوق، نئے عزائم اور ولولوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، یوں محسوس ہو رہا ہے، تاریکیاں سمٹ رہی ہیں، اجالے پھیلتے جا رہے ہیں۔ اور

ع سنگریزے تمام یاقوت بن گئے ہیں

"تعلیم کا مسئلہ" قیامِ پاکستان سے اب تک لاینحل چلا آ رہا ہے، سامراجی آقاؤں سے ورثے میں ملے ہوئے اس نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لئے کئی کمشن بٹھائے گئے اور متعدد پالیسیاں ترتیب دی گئیں، مگر مرض کا علاج نہ ہو سکا۔ موجودہ حکومت کی طرف سے بھی اکتوبر ۷۷ء میں اسلام آباد میں قومی تعلیمی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، لیکن اس

تعلیمی کانفرنس کو یہ لازوال اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس میں شرکت کے لئے بطورِ خاص جناب محمد قطب اور الاستاذ محمد سعد الرشید سعودی عرب سے پاکستان تشریف لائے۔ جناب محمد قطب، اپنے بڑے بھائی سید قطب شہید کی طرح عظیم اسلامی مفکر اور بلند پایہ مصنف

سید محمد قطب

ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی اور اسلامی دعوت کے مختلف پہلوؤں پر اب تک ان کی ڈیڑھ درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان میں سے بیشتر کے انگریزی، فرانسیسی اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ محمد قطب اپنے خاندان کے دوسرے افراد اور اخوان المسلمون کے رہنماؤں اور کارکنوں کے ہمراہ ۱۹۶۵ء سے مسلسل سات برس تک صدر ناصر کی جیل میں انسانیت سوز ظلم و تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ان کے بڑے بھائی سید قطب کو اعلائے کلمۃ الحق کے جرم کی پاداش میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں صدر سادات نے اخوان المسلمون کے ہزاروں دوسرے کارکنوں اور رہنماؤں کے علاوہ انہیں بھی تمام الزامات سے بری الذمہ قرار دے کر رہا کر دیا، لیکن تحریکی سرگرمیوں کی اجازت نہ مل سکی۔ اسی دوران میں جامعۃ الملک عبدالعزیز کی طرف سے انہیں اپنے ہاں پروفیسر کی حیثیت سے تعلیمی و علمی خدمات انجام دینے کی دعوت دی گئی، جسے انہوں نے قبول کر لیا اور آج کل جناب محمد قطب تحریکِ اسلامی کے اولین مرکز، مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر علمی و فکری کام میں مصروف ہیں۔

جناب سعد الرشید سعودی عرب کے ممتاز اہلِ فکر و نظر میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ جامعہ ملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں کلیۃ الشریعۃ کے سربراہ ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ انہوں نے تنظیم اساتذہ کی نظریاتی و علمی خدمات پر اظہارِ تحسین کرتے ہوئے پاکستانی اساتذہ کو کلیۃ الشریعۃ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دینے کا بھی اعلان کیا اور ان وظائف کے لئے اہلِ افراد کے انتخاب کا اختیار تنظیم اساتذہ کو تفویض کیا۔

تعلیمی کانفرنس سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، عرصۂ دراز تک تشنۂ تکمیل رہیں اور سرکاری اہتمام کے ساتھ ہونے والی یہ عظیم الشان کانفرنس بھی، علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکی۔

تنظیم اساتذہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس جہاں اس لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل تھی کہ اس میں شرکت کے لئے ملک کے دور دراز علاقوں سے اساتذہ آئے اور اس میں ہر ہر علاقے اور ہر ہر گریڈ کے اساتذہ نے شرکت کی اور یوں یہ کانفرنس بلاشبہ اساتذہ کی نمائندہ کانفرنس تھی، وہاں یہ امر بھی مسرت بخش ہے کہ اس کانفرنس میں تعلیم کے ہر ہر پہلو اور مسئلے کا بنظرِ غائر جائزہ لیا گیا ہے۔ بیس اہم تعلیمی موضوعات پر سٹڈی گروپس تشکیل دیئے گئے اور ملک کے معروف اہلِ علم کو ان گروپس کا انچارج بنایا گیا۔ کھلے اجلاسوں کی تقاریر اور مقالے بھی بڑے جاندار تھے اور مقررین و مقالہ نگار حضرات پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ علمی موضوعات پر تقاریر یا مقالے خاصی "بور" قسم کی چیز ہوتے ہیں اور انہیں سننا خاصا صبر آزما کام ہوتا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی کانفرنسوں کے "بزنس سیشن" کے لئے حاضرین پکڑ پکڑ کر لائے جاتے ہیں اور بامر مجبوری بیٹھے ہوئے سامعین، بار بار پہلو بدل کر اپنی اکتاہٹ کا اظہار کرتے رہتے ہیں، لیکن تنظیم اساتذہ پاکستان کے زیرِ اہتمام اس کانفرنس کا معاملہ قطعاً مختلف تھا۔ یہاں نہ صرف عام اجلاسوں کے دوران آڈیٹوریم میں تل دھرنے کو جگہ نہ بچتی تھی، بلکہ خشک قسم کے بزنس سیشن میں بھی مندوبین کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہتی اور وہ ایک ایک نکتے اور پہلو پر بھرپور دلچسپی کے ساتھ غور و خوض کرتے۔

اگرچہ ان مطالعاتی نشستوں کی سفارشات اور تجاویز ابھی منظرِ عام پر نہیں آئیں، کیونکہ بیس مطالعاتی گروپوں کی یہ سفارشات سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین کے لئے بہر حال کچھ وقت درکار ہے، تاہم امید کی جانی چاہیئے کہ سٹڈی گروپس کی یہ سفارشات اور تجاویز پاکستان میں درس و تدریس کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بہت اہم اور ٹھوس کام ہوگا۔ تنظیمِ اساتذہ کے رہنما ان تجاویز و سفارشات کو جلد حتمی شکل دے کر اربابِ اقتدار تک پہنچا دیں گے اور یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ حکومت ان سفارشات پر بلا تاخیر غور و خوض کرے گی اور مفید تجاویز پر عملدر آمد کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی جائیگی۔

پیپلز پارٹی پر موت سے پہلے کی علامتیں طاری ہیں

کراچی کی سیاست میں نئی لہروں کا تجزیہ

ملک سعید حسن جب پیپلز پارٹی کے قائم مقام سیکرٹری جنرل بنائے گئے تھے، تو سیاسی حلقے حکومت اور پیپلز پارٹی کے درمیان مصالحت کی بات کرنے لگے تھے۔ ان حلقوں کا خیال تھا کہ ملک صاحب کا اچانک منظرِ عام پر نمودار ہونا، پارٹی کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیپلز پارٹی کے ہمنوا جریدے بھی "اچھی خبروں" کی نوید دینے لگے۔ پارٹی کا تند لہجہ بھی نرم پڑ گیا اور بیگم نصرت بھٹو نظر بندی سے رہائی کے بعد خاموش اور متین خاتون بننے کی ریہرسل کرنے لگیں۔ پارٹی کے حلقے راجہ انور کی قیادت میں تحریک خود سوزی کی ناکامی اور ان کی مشکوک سرگرمیوں سے خاصے پریشان تھے۔ بیگم بھٹو نے جس حد تک راجہ انور پر اعتبار کر لیا تھا اس کا انہیں سخت صدمہ ہے اور اب وہ پارٹی کارکنوں کو کسی پر اندھے اعتماد کا مشورہ نہیں دیتیں۔ اس پس منظر میں پی پی یقیناً منتشر ہو جاتی، لیکن بھٹو کی شخصیت اور مقدمے کے فیصلے کے انتظار نے کچھ سخت جاں اور کچھ مفاد پرست عناصر کو ثابت قدم رکھا ہے۔ ان کارکنوں کو یقین ہے کہ پارٹی کی قیادت ان کی صحیح رہنمائی کرے گی اور پارٹی موجودہ بحران سے نکل جائے گی۔ بیگم بھٹو پارٹی کے ریاکار اور خود غرض عناصر سے تنگ آ چکی ہیں اور انہیں اب پھر ان پرانے ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جنہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس پارٹی کو کامیاب کرایا تھا، لیکن بیگم صاحبہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ تمام کارکن اور لیڈر بائیں بازو کے شدت پسند خیالات کے حامی ہیں۔ بیگم صاحبہ خود بھی اپنے افکار کا اظہار کرتے ہوئے کہہ چکی ہیں کہ معراج محمد خاں جیسے شدت پسند سیاسی لچک سے عاری تھے، اس لئے وہ بھٹو کی دُور اندیشی کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اب بیگم بھٹو کو معراج جیسے سخت شدت پسندوں کی بھی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہی لوگ بھٹو کو بچا سکتے ہیں اس سلسلے کے ابتدائی کام کے لئے ملک سعید حسن کراچی وارد ہوئے اور بھٹو پارٹی کے ہمنوا "امن" اخبار نے سرخی داغ دی کہ معراج محمد خاں اور بیگم بھٹو میں معاہدہ ہو گیا ہے اور اب بائیں بازو والے بھٹو کے لئے جدوجہد کریں گے۔

ملک سعید نے کراچی میں اپنی موجودگی کو سیاسی طور پر ابھارنے کے لئے ایک پریس کانفرنس بھی کر ڈالی۔ ہمارے خیال میں اگر وہ یہ پریس کانفرنس نہ کرتے، تو شاید شہر کے صحافیوں پر ان کا کچھ سیاسی دبدبہ قائم رہتا، لیکن پریس کانفرنس میں ان کی فراست، سیاسی بصیرت اور وکالت کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ دراز قد سرخ سفید رنگت والے ملک سعید حسن پی پی میں واقعی ایک خوبصورت اضافہ ہیں اور اگر ان کے پاس سیاسی تجربہ ہوتا، تو وہ "سہنے منڈے" کی جگہ لے سکتے تھے اور خوبصورت چہروں کو پسند کرنے والے بھٹو گھرانے کے اچھے ترجمان بن سکتے تھے، لیکن کیا کیجیے ان کی ناتجربہ کاری کو؟

ملک سعید حسن کی اس پریس کانفرنس کا وقت چار بجے تھا، پریس کلب میں لوگ انتظار کر رہے تھے۔ ان کے حامی کارکن اور پارٹی پر جان نثار

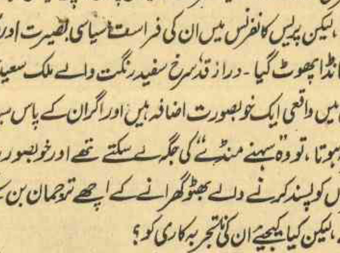

ملک سعید حسن

کرنے والی ایک دو خواتین بھی موجود تھیں۔ لوگ منتظر رہے اور موصوف چار بج کر چالیس منٹ پر نیلے سوٹ میں ملبوس تشریف لائے۔ انہوں نے پرجوش انداز میں انگریزی میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا، لیکن صحافیوں کے سوالات کے سامنے جلد ہی اکھڑ گئے۔ غالباً ان کے کارکنوں نے انہیں کہہ رکھا تھا کہ کراچی کا پریس کلب پی پی کا گڑھ ہے، وہاں انہیں کوئی نہیں چھیڑے گا، لیکن صحافی پھر صحافی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سیاسی رہنما کو اپنے قد کا تعین کرنے کے لیے ذہانت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ محض لمبے قد اور نیلے سوٹ سے یا انگریزی سے کام نہیں چلتا۔ پی پی کے کارکنوں کی کچھ تعداد موصوف کے ساتھ پریس کلب اُٹھ آئی تھی، لیکن کلب کی انتظامیہ نے انہیں پریس کانفرنس ہال سے باہر نکال دیا، اس کے باوجود کچھ کارکن صحافیوں کی صفوں میں گھس بیٹھے اور جب کوئی صحافی ٹیڑھا سوال کرتا تو پیچھے سے یہ کھسر پھسر سنائی دیتی کہ یہ جماعتیہ ہے۔ پی این اے کا ورکر ہے۔ پارٹی کے کچھ وفادار صحافی جو کہ کلب کے حلقوں میں بھی پی پی کے کارکن سمجھے جاتے ہیں، ملک سعید حسن کو خوش کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے لیکن ملک صاحب کی یہاں پر فارمینس سے انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ ایک خاتون نے جو سفید چادر اوڑھے ہوئے تھیں اور شاید کسی رشتہ سے صحافی بھی ہیں، ملک سعید سے جائے پر مؤدبانہ کہا کہ جناب میں پارٹی کی خدمت کرنا چاہتی ہوں، مجھے موقع دیں ———— لیکن اس پر ملک سعید نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ بی بی ابھی اس کا وقت نہیں آیا انتظار کریں۔ پارٹی کے عام کارکن اب تک یہی سوچ سوچ کر وقت گزار رہے ہیں کہ کچھ کرنے کا وقت کب آئے گا اور قیادت کیا کرنا چاہتی ہے؟ اس مبہم فضا میں پی پی کا وہ "جیالا" سخت پریشان ہے جو شدید خدشات کے باوجود پارٹی پر جان نثار کرنے کا دعویٰ کرتا رہتا ہے۔ شہر میں مجموعی طور پر پی پی کی سرگرمیاں ناپید ہیں۔ مزار قائد کے پیچھے پارٹی کا سیکرٹریٹ ویران نظر آتا ہے۔ پارٹی کے صوبائی صدر سابق وزیر اعلیٰ غلام مصطفٰے جتوئی کبھی کبھی گھر پر پریس کانفرنس کر ڈالتے ہیں اور لمبا چوڑا مقالہ پڑھ کر صحافیوں کو بور کرتے ہیں۔

سابق صوبائی وزرا میں حاجی قاسم عباس پٹیل پارٹی کے کارکنوں کے ہاتھوں پٹائی کے بعد گوشۂ گمنامی میں چلے گئے ہیں اور سابق وزیر عبداللہ بلوچ ایل ایل بی کا امتحان دے رہے ہیں۔ عبدالوحید کٹپر لاڑکانہ چھوڑ کر کراچی آباد ہو گئے ہیں اور خاموشی سے وکالت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنی وزارت کے دنوں کی کمائی کو جائدادوں میں تبدیل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ کمال اظفر پی پی کو لال جھنڈی دکھا چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک بیان چھپا ہے جس میں انہوں نے مارشل لا سے محاذ آرائی پر پی پی قیادت کو لعن طعن کی ہے۔ پارٹی کے ایک اور شور مچانے والے لیڈر این ڈی خاں گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیاری کے عبدالستار گبول بالکل لاپتہ ہیں اور کبھی کبھی وہ اپنی کالی مرسڈیز کار

میں گھومتے پھرتے نظر آجاتے ہیں۔ پارٹی کے دفتر میں اب صرف احترام الحق تھانوی نظر آتے ہیں جو احترام کم ہیں اور تھانوی زیادہ۔

۲۵ دسمبر کو قائدِ اعظمؒ کا یومِ ولادت منایا گیا، لیکن مزارِ قائد کے بالکل ساتھ جس پارٹی کا صدر دفتر ہو، اس پارٹی کا ایک قائد بھی مزارِ قائد پر حاضری دینے نہیں گیا۔ اس طرح حواری بومدین کے انتقال پر بھی تیسری دنیا کے سلسلہ میں بھٹو کی "خدمات" کا دعویٰ کرنے والوں نے ایک بھی تعزیتی جلسہ نہیں کیا اور نہ کوئی بیان دینے کی زحمت گوارا کی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پس منظر میں پریشان ہونے والا عام کارکن کیا کرتا ہے۔ پارٹی کے عام کارکن یہ سوچتے ہیں کہ وہ اگر کچھ کریں بھی تو کس کے لیے اور کس مقصد کے لیے۔ سیاست کو محض بھٹو کی شخصیت تک محدود کر دینے سے پارٹی پُرکشش نعروں کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل اور سیاسی حربوں سے محروم ہو گئی ہے۔ پارٹی کے کارکنوں کے اپنے بھی لاتعداد مسائل ہیں، جن پر توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔ بھٹو دور میں تو پارٹی کارکنوں کے ایک فون پر ان کے لیے 'رزق' کے دروازے کھل جاتے تھے۔ اپنے اس 'شاہانہ دور' کی عادات کو یہ کارکن بھول نہیں پاتے اور ظاہر ہے 'رزقِ حلال' کمانا اتنا آسان نہیں۔

اس کے علاوہ پارٹی کا ایک حلقہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ پارٹی کی ساری سوچ بچار کا محور اس وقت صرف بھٹو ہے، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ بھٹو کے مقدر کا فیصلہ کچھ ہی ہو، بھٹو کی افادیت اب ختم ہو چکی ہے، اس لیے کیوں اس کے لیے جان کو تکلیف دی جائے۔ پارٹی کے ان کارکنوں کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قربانی سے انہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟

کچھ نوجوان قیادت کی خالی جگہ پاکر آگے آئے تھے لیکن قیادت کا شوق جلد ہی پورا ہو گیا اور شدت پسندی نے جب انہیں حقائق کی چٹان کے سامنے کھڑا کیا تو وہ توازن قائم نہ رکھ سکے۔ اب

اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

فیصل۔ پاسبانِ حرم

از

محمد صدیق قریشی

- دنیائے اسلام کے عظیم رہنما کی زندگی کے خدوخال
- بڑی طاقتوں کے ساتھ آویزش میں جرأت مندانہ کردار

اور اس فقید المثال ہستی کے آخری لمحات کی دُکھ بھری رُوداد

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ

قیمت ۱۰ روپے

اپنے آرڈر جلد بک کرالیجیے

پی پی اپنے ہمنوا اخبارات اور جریدوں کی خود ساختہ خبروں اور شہر کے چائے خانوں میں پھیلائی جانے والی افواہوں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان میں کبھی خلیج کی ریاستوں کے حکمرانوں کو بھٹو کی رہائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ایران میں شہنشاہ کی تباہی کے بعد امریکہ کو اس خطہ میں بھٹو کی ضرورت ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ روسی وزیرِ اعظم کوسیگن اپنا دورۂ پاکستان ملتوی کر دیں گے کیونکہ وہ بھٹو کو بہ حیثیت وزیرِ اعظم دیکھنا چاہتے ہیں۔ غرض کبھی بین الاقوامی سیاست کا سہارا، کبھی ایران کے حالات اور کبھی باجپائی کی دھمکی ان افواہوں کی دلیل ہوتی ہے۔ یہی پیپلز پارٹی کا سہارا ہیں اور یہی ان کی امید ہیں۔

پارٹی کے کارکنوں سے بات چیت کی جائے، تو وہ پریشانی کا ذکر کرتے ہیں۔ حکمرانی کا نشہ تو ان کے ذہن سے اُتر گیا ہے، اب وہ اپنی قیادت سے نالاں نظر آتے ہیں۔ ملک سعید حسن کے دعوے کہ ملک کے نوّے فیصد عوام پی پی کے ساتھ ہیں اور کراچی اب پیپلز پارٹی کا شہر بن چکا ہے اور ہماری طاقت ہے، عام کارکنوں کو سخت ذہنی خلجان میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اصل حقیقت تو ہمارے سامنے ہے کہ کتنے فیصد عوام ہمارے ساتھ ہیں اور کیوں ہیں اور کراچی فی الحقیقت کس کا شہر ہے۔ کراچی کے کارکن تو اس امید پر جی رہے تھے کہ سارا پنجاب ہمارا شہر ہے۔ ملک سعید حسن نے کیا کہہ دیا کہ کراچی ہماری پارٹی کا شہر بن چکا ہے۔ اس حقیقت کو جب وہ دیکھتے ہیں تو انہیں سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اگر کراچی کی طرح ہی پنجاب بھی پی پی کا گڑھ ہے تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ۔

عام کارکنوں کا کہنا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں ہمیں افواہوں اور دعووں کے سہارے زندہ رکھا جا رہا ہے۔ ہم کب تک اس عالم میں زندہ رہیں۔ ہمارے اپنے مسائل ہیں۔ ہمیں بھی روزی کمانی ہے، بچے بھی پالنے ہیں۔ ہماری قیادت ذہنی طور پر دیوالیہ ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔

ملک سعید حسن کے پریس کانفرنس کے دعووں کے بعد اُن کی مایوسی میں اور زیادہ اضافہ نظر آتا ہے۔ پی پی کی یہ بدحالی صرف کراچی تک محدود نہیں، بلکہ پورے سندھ میں یہی صورتِ حال ہے۔ اب تو سندھ کی علیحدگی کی دھمکی دینے والے بھی اپنا لہجہ بدلنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ انہیں احساس ہو گیا ہے کہ اُن کی قیادت پُرجوش دعوے تو کرتی ہے، مگر عملاً اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ کراچی پریس کلب میں جب ملک سعید نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہمیں فوج سے تعاون کرنا چاہیئے، یہ ہماری اپنی فوج ہے، تو پارٹی کے حامی بہت سے کارکن صحافیوں کا مُنہ کڑوا ہو گیا کہ ابھی یہ جوش تھا اور ایک دم افہام و تفہیم کی باتیں ہونے لگیں۔

حیدرآباد سندھ میں پارٹی کے حلقے خاموش ہیں۔ جام شورو کے ہنگامے میں نہتے فوجی کو قتل کرنے والے چار غنڈے گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ کالجوں کے امتحانات شروع ہو چکے ہیں۔ دادو کے علاقے میں کچھ لوگ اب این ڈی پی کی طرف کھسک گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عبدالحمید جتوئی کی این ڈی پی میں شمولیت سے اب لاڑکانہ کے بجائے دادو، سندھ کا سیاسی مرکز بن سکتا ہے، لیکن جتوئی صاحب کی شمولیت کے ساتھ ہی این ڈی پی میں معتدل مزاج اور شدت پسندوں کے درمیان کشمکش بڑھ گئی ہے۔ لاڑکانہ خاموش ہے اور وہاں پی پی کے حامی اب نائب امیر جماعتِ اسلامی مولانا جان محمد عباسی کے خلاف افواہیں پھیلانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ان افواہوں میں کبھی اُن کے بھائی کو ملوث کیا جاتا ہے اور کبھی ان کے بیٹے کو۔

جیکب آباد کے در محمد اوستو گوشہ نشین ہیں۔ رسم پوری کرنے کو کبھی کبھی سکھر تک آجاتے ہیں، جہاں منگی گھرانہ تجارتی انداز میں حالات کے بدلنے کا منتظر ہے۔ نواب شاہ کے غلام مصطفےٰ جتوئی کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں وقت گزار رہے ہیں۔ خیرپور خاموش ہے۔ بدین کے مخدوم اب سندھی مشاعرے بھی نہیں کرتے اور سانگھڑ والے تو صرف حُروں کے مقدمۂ قتل کی رو داد میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

ہر جگہ پی پی کے تھوڑے بہت کارکن ہیں جو افواہوں کا کاروبار کر رہے ہیں اور یہی اُن کے جینے کا سہارا ہیں۔

شہر میں بائیں بازو کے اشتراک سے معراج محمد خاں، تاج محمد لنگاہ، خورشید حسن میر، جے اے رحیم، کوثر نیازی اور حنیف رامے کو پی پی میں واپس لانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ پارٹی کے وڈیرے ناکام ہو چکے ہیں اور شاید اُنہیں اب سوشلسٹ خون کی ضرورت ہے۔ پارٹی کے کارکن پریشان ہیں کہ کل جنہیں غدار، نااہل، سازشی اور مولانا وہسکی کہہ کر پارٹی سے ذلیل کر کے نکالا گیا تھا اب وہ کس طرح پارٹی کی ضرورت بن گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو مارا پیٹا گیا، ان کے اہلِ خاندان کو ذلیل اور تنگ کیا گیا۔ یہ سب اب کیسے پارٹی کی تقدیر بن رہے ہیں؟

معراج محمد خاں کی پی پی میں شمولیت کی خبر خود ان کے دوستوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ پی پی کے حلقے تو یہ دعوے کر رہے ہیں کہ معراج محمد خان کو پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنایا جا رہا ہے، لیکن معراج کے ساتھی حیران ہیں کہ اتنی ذلت اور رسوائی کے بعد کس طرح معراج پی پی کی قیادت سے صلح کر رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ کراچی آتی ہیں، تو شہر کے مخصوص افراد سے ملاقات کر کے چلی جاتی ہیں۔ ڈیفنس سوسائٹی میں جتوئی کے بنگلے تک پہنچنا لیاری کے کارکنوں کے بس کی بات نہیں۔ لیاری کے کچھ لڑکے گذشتہ دنوں ہنگاموں میں گرفتار ہوئے تھے، ان کے گھروں کی عورتیں پارٹی کے لیڈروں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں، لیکن کوئی ان کی خبرگیری کے لیے نہیں آتا کہ اُن کے گھر والوں کی رہائی کے لیے راستہ پیدا کرے۔

اب کارکنوں کی مدد کے لیے نہ آنا، کارکنوں کے درمیان رابطہ ختم ہو جانا اور بے حس قیادت پیپلز پارٹی کا سب سے بڑا المیہ ہیں جس کا کارکنوں کے پاس کوئی حل نہیں۔

مبصرین کہہ سکتے ہیں کہ یہ ساری علامتیں موت سے پہلے کی علامتیں ہیں، لیکن یہ مبصرین یہ بتانے میں محتاط ہیں کہ موت کس کی ہو گی؟ کارکنوں کی، پارٹی کی یا قیادت کی۔

●●

ممتاز عامر

احسان الٰہی ظہیر کس کو کس سے لڑانا چاہتے ہیں؟

پاکستان قومی اتحاد کی توہین کس نے کرائی؟

علماء کونسل کے زیر اہتمام بڑے جوش و خروش کے ساتھ سہ روزہ نظامِ مصطفٰےؐ کانفرنس شروع ہوئی۔ اس کا افتتاحی اجلاس جمعہ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۸ء کو مسجد شہداء میں منعقد ہوا۔ اس سے خطاب کرنے والوں میں پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود، وزیرِ محنت چودھری ظہور الٰہی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شامل تھے۔ اس روز جلسے کے شرکاء نے جس جذبے کا اظہار کیا، اگلے ہی دن اس پر اوس پڑ گئی۔ ہوا یہ — کہ علماء کونسل نے شہر بھر میں کانفرنس سے متعلق چسپاں کئے — بڑے بڑے پوسٹروں میں اس کے انعقاد کا مقام نمایاں طور پر جناح ہال شائع کیا۔ اس سلسلے میں پندرہ روز قبل ڈپٹی کمشنر سے اجازت حاصل کر لی گئی، لیکن جب لاہور میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر سے رابطہ قائم کیا گیا، تو انہوں نے واضح کیا کہ جناح ہال میں اجلاس منعقد نہیں کیا جا سکتا۔

علماء کونسل کے عہدیدار جناح ہال کا کوئی متبادل تلاش کرنے کے بجائے اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی نہ کسی طرح اسی جگہ اجلاس کی اجازت مل جائے۔ مارشل لاء حکام سے بات کی گئی، تو وہاں بھی شنوائی نہ ہوئی۔ اس سارے معاملے کا ناخوشگوار پہلو یہ تھا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر نے جمعہ کے افتتاحی اجتماع میں عوام کے جذبات ابھارتے ہوئے یہ اعلان داغ دیا کہ اجلاس جناح ہال ہی میں ہوگا، چاہے کچھ بھی ہو، ساتھ ہی لوگوں کو یہ دعوت دے ڈالی کہ وہ جناح ہال پہنچ جائیں۔ ادھر خاکسار رہنما جناب اشرف خان اس سے بھی آگے چلے گئے اور کہا کہ خاکسار بیلچے لے کر پہنچیں گے اور جناح ہال میں اجلاس ہو کے رہے گا۔

ان اعلانات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اکّا دکّا شرکاء ہفتے کے روز شام کو ساڑھے چار بجے کے قریب جناح ہال پہنچنا شروع ہو گئے، لیکن وہاں ان کا خیر مقدم اور رہنمائی کرنے کو کوئی موجود نہ تھا۔ لوگوں کا سامنا جاتے ہی پولیس والوں سے ہوا جو جناح ہال کے سامنے اور لان میں پھیلے ہوئے تھے۔ تقریباً اسی وقت اسسٹنٹ کمشنر بٹی بھی وہاں پہنچے۔ لوگ پولیس والوں سے پوچھتے کہ یہاں کوئی جلسہ ہو رہا ہے؟ تو جواب ملتا کہ اجازت نہیں مل سکی، لہٰذا اب جلسہ نہ ہوگا۔ پولیس والوں اور جلسے میں شرکت کے متمنی لوگوں کے مابین دلچسپ گفتگو ہوتی رہی، لوگ کہتے کہ ہم تو شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور دوسرے شہروں سے آئے ہیں، ہمیں تو یہ علم نہ تھا کہ اجازت نہیں ملی۔ وہاں پر موجودہ سول حکومت کے با اختیار یا بے اختیار ہونے پر بھی تبصرہ ہوتا۔

نمازِ مغرب تک ڈیڑھ دو سو افراد جناح ہال پہنچ چکے تھے، اخبار نویس بھی موجود تھے، مگر کانفرنس کے منتظمین کا وہاں پر نام و نشان نہ تھا کوئی کہتا کہ وائی ایم سی اے ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت لی جا رہی ہے، تھوڑی دیر بعد کوئی اور بتاتا کہ نہیں، وہاں تو کسی نے پہلے سے بکنگ کرا رکھی ہے۔ پولیس نے آنے والوں کو جناح ہال کے لان میں نمازِ مغرب باجماعت ادا کرنے کی اجازت دے دی۔ فضا میں پراسراریت پائی جاتی تھی۔ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ بعض لوگ یہ خدشہ بھی ظاہر کرتے تھے کہ کہیں پولیس کے ساتھ تصادم ہی نہ ہو جائے۔

لوگ نمازِ مغرب ادا کر رہے تھے کہ ایک مرسڈیز جناح ہال کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ اس میں سے علامہ احسان الٰہی ظہیر، علماء کونسل کے سیکرٹری مولانا احسان اللہ فاروقی اور چند اور حضرات برآمد ہوئے۔ یہ لوگ پولیس کو دیکھتے ہوئے اس طرف بڑھے جہاں نماز ہو رہی تھی۔ جماعت ہو چکی تھی۔ انہوں نے آتے ہی نماز کی نیت باندھی۔ لوگ اب اس کے منتظر تھے کہ دیکھئے یہ حضرات کیا خبر لاتے ہیں۔

جب سب لوگ نماز پڑھ چکے، تو علماءِ کونسل کے سیکرٹری جنرل نے اپنے گرد جمع لوگوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جناح ہال میں جلسہ کرنے کے لئے کی گئی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا جس پر مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور چودھری ظہور الٰہی نے ہدایت کی ہے کہ احتجاجاً اس کانفرنس کا پروگرام منسوخ کر دیا جائے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے یہاں بھی جذبات ابھارنے کی اپنی مخصوص تکنیک برتی اور کہا کہ ہم یہاں فلم نہیں دکھا رہے تھے، مجرا نہیں کر رہے تھے۔ ہم اسلام اور سرورِ کائنات کے نظام کی بات کرنا چاہتے تھے، چونکہ حکومت خود نظامِ مصطفٰےؐ کے نفاذ کے لئے کوشاں ہے، اس لئے اس کی حمایت ہونا چاہیئے تھی۔ پھر علماءِ کونسل پاکستان قومی اتحاد کا حصہ ہے اور اتحاد حکومت میں شامل ہے، اس لحاظ سے اجازت ملنا چاہیئے تھی۔ اب صورت یہ ہے کہ مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور قومی اتحاد کے دوسرے رہنماؤں نے حکم دیا ہے کہ کانفرنس منسوخ کی جائے، لہٰذا ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

علامہ صاحب نے پاکستان قومی اتحاد پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس واقعہ سے اس کی توہین ہوئی ہے، کیونکہ حکومت میں شامل ہوتے ہوئے بھی ہال حاصل نہیں کیا جا سکا۔ اس کے بعد علامہ صاحب بلدیہ لاہور کے ایڈمنسٹریٹر پر برسے اور آخر میں جذباتی انداز میں دعا کی کہ جو لوگ اللہ کے دین کی راہ میں حائل ہیں، وہ تباہ ہوں۔

۵ بج کر ۴۵ منٹ پر تقاریر کا سلسلہ ختم ہوا اور لوگ نعرے لگاتے ہوئے، باہر آ گئے۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی خاکسار تحریک کے رہنما محمد اشرف خان بھی جناح ہال پہنچے۔ انہوں نے بھی بچے کھچے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے دھواں دھار تقریر کی اور سول حکومت میں شامل قومی اتحاد کے وزراء سے مطالبہ کیا کہ وہ کابینہ سے باہر آ جائیں۔ انہوں نے بھی اس کو قومی اتحاد کی توہین قرار دیا اور کہا کہ اس واقعہ نے ثابت کر دیا ہے کہ وزراء بے بس ہیں، لہٰذا قومی اتحاد کا وقار بحال کرنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ اتحاد کے وزراء حکومت چھوڑ دیں۔

علماء کونسل اور پاکستان قومی اتحاد نے جس طرح جناح ہال کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا اور جس کے نتیجے میں کانفرنس منسوخ ہوئی، اس سے کارکنوں کے جذبات بُری طرح مجروح ہوئے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ بعض لوگ خاص منصوبے کے تحت ایسی صورتِ حال پیدا کر دیتے ہیں۔ اتحاد کے رہنماؤں کو ان چہروں کی پہچان ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کے پروگرام کو سبوتاژ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

قادیانیوں کی بھیانک سازش پکڑی گئی

۱۹۷۹ء کا خوفناک منصوبہ

- پیر پگارا ۹ر جنوری کو اتحاد سے الگ ہوجائیں گے
- پیر پگارا نئے اتحاد کی صدارت کے لیے اصرار نہیں کریں گے
- ہمیں اقلیت قرار دینے کی سازش جماعتِ اسلامی کی تیار کردہ تھی
- مسٹر بھٹو یقینی طور پر بچ جائیں گے۔
- ۷ر جنوری سے قبل نیا اتحاد وجود میں آجائے گا
- پنجاب کو مفلوج کرنے کے لیے نیا اتحاد کافی ہوگا
- ہمارے لیے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بہتر اور کوئی نہیں۔
- بلوچستان میں تیلی لگانے کی دیر ہے۔

پچھلے چند ماہ سے پاکستان بڑی تیزی سے سیاسی انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے، مفادات کی جنگ شدت پکڑ گئی ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل بے رحمی سے جاری ہے۔ عام آدمی حیران ہے کہ تحریک نظامِ مصطفٰے میں پیش کی جانے والی قربانیاں اتنی جلد ضائع کیوں گئیں اور منزل دھندلکے میں کیوں غائب ہوتی چلی گئی۔ ہمارے راولپنڈی کے نمائندے نے ایک خوفناک دستاویز ارسال کی ہے جسے دیکھ کر یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قادیانی حضرات ملک و ملت کے خلاف ایک بھیانک سازش میں مصروف ہیں۔ دستاویز کسی تبصرے کی محتاج نہیں، یہ چیخ چیخ کر قومی سیاست میں نقب لگانے والے خفیہ ہاتھوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ آیئے سنیے یہ دستاویز ہمارے نمائندے کو کیسے ملی؟

اس سازش کی ایک کڑی مجھے دو صفحات پر مشتمل ایک خط کی صورت میں ہاتھ لگی۔ اس کا اندازہ نہیں ہوسکا کہ یہ خط کتنے صفحات پر مشتمل ہوگا اور کس نے، کہاں سے کس کو لکھا ہوگا؟ البتہ ان دو صفحات کے اوپر نمبر ۳ اور نمبر ۴ لکھا ہوا ہے۔ خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام آباد یا راولپنڈی کے کسی شخص کو بھیجا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس خط تک میری رسائی کیونکر ہوئی؟

۳۰ر دسمبر کو میں اپنی موٹر سائیکل پر اسلام آباد جارہا تھا۔ مری روڈ کے آخری موڑ پر جہاں سڑک اسلام آباد زیرو پوائنٹ کی طرف مڑتی ہے، سرخ اشارہ روشن تھا۔ ٹریفک رک گئی اور میں نے بھی موٹر سائیکل کھڑی کرلی۔ ایک موٹر سائیکل سوار مجھ سے آگے نکل کر ویگن نمبر RIF1573 کے بائیں طرف کھڑا ہوگیا۔ چیک کا کوٹ اور پٹھانوں جیسی گول ٹوپی پہنے ہوئے یہ سوار موٹر سائیکل پر بہت جسیم معلوم ہورہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی یا طویل "قلمیں" بھی پیچھے سے ہوکر دکھائی دے رہی تھیں، مگر صرف کان کے قریب کا حصہ۔ میں نے اس کی ہنڈا 175 موٹر سائیکل کے نمبر کی طرف بھی دیکھا، تو وہاں APPLIED FOR لکھا ہوا تھا۔ کیریئر پر دو نیلے رنگ کی فائلیں اور ایک موٹی سی ڈائری بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سبز اشارے نے ٹریفک کو متحرک کردیا۔ اس کے بعد میں نے موٹر سائیکل سوار سے توجہ ہٹالی۔ مری روڈ اور زیرو پوائنٹ کے درمیان نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد دائیں ہاتھ اوپر کی جانب سے بھی ایک سڑک یہاں ملتی ہے۔ بالکل اسی جگہ اس موٹر سائیکل سے فائلیں اور کاغذات گر گئے۔ تیز رفتاری کے باعث موٹر سائیکل کافی آگے جاکر رکی، اتنے میں بے پناہ دھواں چھوڑتی ہوئی ایک اومنی بس وہاں سے گزری جو بکھرے ہوئے کاغذات مزید بکھیر گئی۔ موٹر سائیکل سوار نے بڑی تیزی سے الٹے سیدھے کاغذات سمیٹے اور پھر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ میرے وہاں پہنچنے کے دوران میں ایک ویگن گزری، تو مجھے ایک کاغذ دائیں جانب اڑتا ہوا نظر آیا۔ میں نے موٹر سائیکل روک کر کاغذ اٹھایا، تو قریب ہی مجھے ایک اور ویسا ہی کاغذ اٹھالیا۔

میں نے مزید تلاش کی، مگر اور کچھ نہ ملا۔ یہ دونوں کاغذ میں نے جیب میں ڈالے اور پھر اس جذبے سے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگا کہ شاید مطلوبہ آدمی کو کاغذات دینے میں کامیاب ہوجاؤں، لیکن زیرو پوائنٹ سے آب پارہ تک مجھے اس کی جھلک بھی نہیں دکھائی دی۔ فطری تجسس سے مجبور ہوکر جب یہ کاغذات پڑھے، تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

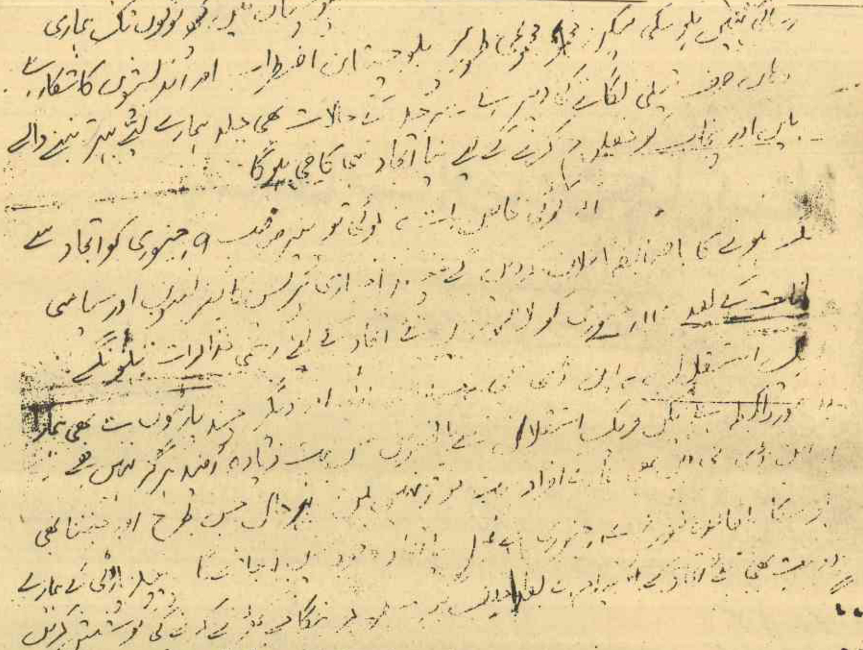

اور

یہ

رہی

دستاویز

. . . .

آپ کو یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ ہم اپنا کام پوری توجہ سے نہیں کر رہے۔ گذشتہ دنوں جب آپ کا پیغام ملا، تو ہمیں اصل جگہ پر موجود نہیں تھا۔ اس لئے سندھ تک آپ کے پیغام کے دیر سے موصول ہونے کے باعث میں جلد جواب نہیں دے سکا تھا؛ البتہ سمیع صاحب کو ہم سب نے تاکید کر دی تھی کہ وہ آپ سے ملاقات کر کے تفصیلات گوش گزار کر دیں۔ نہ جانے وہ بھی آپ تک پہنچنے میں بروقت کامیاب کیوں نہ ہوئے؟

ہمارے کسی آدمی نے برائے راست پیر صاحب سے ملاقات نہیں کی، بلکہ بھٹو صاحب کے خاص آدمی کے ذریعے ہم نے انہیں باور کرا دیا ہے کہ آپ اتحاد سے الگ ہو کر کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں اور آپ کی شخصیت سارے سندھ کے لئے دیوتا کی سی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ پیر صاحب کے قریبی ساتھیوں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ مصالحتی کوششوں کو کسی بھی صورت میں کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ لیگ کے موجودہ انتشار سے ہمیں بے حد و حساب فائدہ ہے، بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ قدرت نے ہمارے دین کو سربلند کرنے کا بہترین موقع پیدا کیا ہے۔ یہ انتشار لیگی سیاستدانوں کو ذلیل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسی طرح نام نہاد قومی اتحاد کا ہوائی قلعہ بھی زمین پر آ رہے گا۔ فوج ویسے بھی اپنے مقاصد میں ناکام ہوتی جا رہی ہے، چونکہ ہمارے دوست بڑی صفائی سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہاں والے مولوی صاحب بہت ہی نیک، بلکہ سراپا حلوہ ثابت ہوئے کہ اتحاد کے منہ پر لات مار کر نکل آئے، چونکہ ہم نے انہیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلا دیا تھا کہ تمہاری موجودگی میں مفتی صاحب کسی طرح بھی صدارت کے مستحق نہیں اور یہ کہ آپ اتحاد سے الگ رہ کر طاقتور ترین بن جائیں گے۔ اب یہ مولوی صاحب اس کے لئے بھی تیار ہو گئے ہیں کہ پیر صاحب سے اتحاد کر لیں گے۔ یہ صرف اس سے خائف تھے کہ پیر صاحب یہاں بھی صدارت کا تقاضا کریں گے، مگر ہم نے پیر صاحب سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی ہے کہ وہ صدارت کے لئے مصر نہیں ہوں گے۔

آپ نالاں ہیں کہ بھٹو صاحب نے ہمیں اقلیت قرار دیا تھا، تو ہم یہاں اس کے لئے ماحول سازگار کیوں کریں، حالانکہ اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں، تو یہ مسئلہ بآسانی سمجھ میں آ جانے والا ہے کہ بھٹو صاحب نے ہمیں خوشی سے غیر مسلم قرار نہیں دیا تھا، بلکہ جماعت اسلامی کے چیلوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پورا ملک میدان جنگ بننے والا تھا۔ تمام مولوی اپنے اپنے مفادات اور فطری جذباتیت سے مغلوب ہو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔ یہ ساری سازش جماعتِ اسلامی کی تیار کردہ تھی۔ مودودی کے حواریوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے تھے۔ ایک طرف ہمیں اور ہمارے دین کو نیچا دکھانا مقصود تھا، تو دوسری طرف بھٹو صاحب کو اقتدار سے الگ کرنا تھا۔ بھٹو صاحب نے قرارداد پاس ہونے تک برابر ہم سے رابطہ رکھا اور اپنی بے بسی کا یقین دلاتے رہے۔ قرارداد پاس ہونے کے بعد انہوں نے ہمارے تمام ذمہ داروں سے فرداً فرداً معافی مانگی اور یہ یقین بھی دلایا کہ وہ ہمارے کسی ساتھی کو تنگ نہیں ہونے دیں گے اور سب کی ملازمتیں بھی بحال رہیں گی۔ انہوں نے تو بعد میں بھی ہمارے کئی ساتھیوں کو اعلٰے ملازمتیں دیں۔

ان حالات میں ہمارا ہر باشعور ساتھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بہتر اور کوئی نہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ بھٹو صاحب بچ جائیں گے۔ ہم اگر محنت سے اپنا مشن جاری رکھیں، تو وہ دن دور نہیں، جب فوجیوں اور جماعتوں کا یومِ حساب شروع ہو سکے گا۔

سندھ میں چند دنوں کے اندر اندر حالات مزید تبدیل ہو کر کم از کم ہمارے لئے بے حد سازگار بن جائیں گے۔ بلوچستان میں کچھ لوگوں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی، لیکن مجموعی طور پر بلوچستان خطرات اور اندیشوں کا شکار ہے، وہاں صرف تیلی لگانے کی دیر ہے۔ سرحد کے حالات بھی جلد ہمارے لئے بہتر بننے والے ہیں اور پنجاب کو مفلوج کرنے کے لئے نیا اتحاد ہی کافی ہوگا۔

اگر کوئی خاص بات نہ ہوئی، تو پیر صاحب ۹ جنوری کو اتحاد سے الگ ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیں گے۔ چند اخباری پریس کانفرنسوں اور سیاسی بیانات کے بعد ۱۳ جنوری کو لاہور میں نئے اتحاد کے لئے رسمی مذاکرات ہوں گے۔

تحریکِ استقلال این۔ ڈی۔ پی مساوات پارٹی اور دیگر چند پارٹیوں سے بھی ہمارا بدستور رابطہ ہے، لیکن تحریکِ استقلال سے بالخصوص ہمیں بہت زیادہ اُمید ہرگز نہیں ہے اور این۔ ڈی۔ پی میں بھی ہمارے افراد بہت مؤثر نہیں ہیں۔ بہر حال جس طرح اور جتنا بھی ہو سکا باقاعدہ طور پر ۱۷ جنوری سے قبل نیا اتحاد وجود میں آ جائے گا۔ پیپلز پارٹی کے ہمارے دوست بھی نئے اتحاد کے قیام کے بعد ملک گیر سطح پر ہنگامے کھڑے کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ خوش خبری اب اسلام آباد کے دوستوں کو بھی سُنا دیجئے گا۔ سمیع صاحب سے اگر آپ کی ملاقات ہو گئی ہو، تو انہیں کہیئے گا کہ سفارتی دوستوں سے مخصوص حالات کے علاوہ دفاتر میں ملاقات سے ہر ممکن گریز کیا کریں۔

آپ کی مطلوبہ رقم کا انتظام فوری اور پورے طور پر کرنے کے لئے . . . .

. . . .

. . . .

عامرہ مجید مفتی

بلند قامت بومدین چل بسا

جانشینی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

الجزائر کے صدر بومدین کی وفات سے نہ صرف تیسری دنیا بلکہ تمام اسلامی دنیا ایک ایسے زیرک، معاملہ فہم اور جرّی رہنما سے محروم ہوگئی، جنہوں نے انصاف، مساوات، آزادی کے اصولوں کی جرأت مندانہ حمایت اور استعمار اور نسلی امتیاز کے خلاف پُرعزم جدّوجہد کے سبب دورِ حاضر کی تاریخ میں ایک لافانی مقام حاصل کیا تھا۔

صدر بومدین مرحوم پچھلے دو ماہ سے موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہے اور دنیا کے مختلف معالجوں کی ازحد کوششوں کے باوجود خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الجزائر کے عوام نے صدر بومدین کی سرکردگی میں فرانس کی نوآبادیاتی غلامی کے خلاف شاندار اور مجاہدانہ طریقے سے جدّوجہد کی۔ ۱۹۵۴ء میں عرب قوم پرستی کی تحریک کے ابھار کے ساتھ ہی الجزائر میں بھی قوم پرست تحریک کا آغاز ہوا اور قابض فرانسیسی فوج کے خلاف قوم پرستوں کی مسلح جدّوجہد کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کی قیادت الجزائر کے قومی محاذِ آزادی نے کی۔ قومی محاذِ آزادی کی فوج ۲۰ ہزار تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کا ہیڈ کوارٹر تیونس میں تھا، جہاں سے مجاہدین الجزائر میں گھس کر فرانسیسی فوج پر چھاپے مارتے تھے جنگِ آزادی کے دوران الجزائر کی حدود میں مجاہدینِ آزادی اور فرانسیسی فوج کے درمیان کئی بار معرکے ہوئے۔ ملک کے اندر جو لوگ بظاہر فرانسیسی حکومت کے ہم نوا دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی درحقیقت انقلابیوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔

۱۹۶۰ء تک فرانسیسی فوج نے ۱۱ ہزار الجزائری مسلمانوں کو جبری بیگار کیمپوں اور دوسرے کیمپوں میں قید رکھا۔ ان کیمپوں کی حالت انتہائی ناقابلِ برداشت تھی۔ ۱۹۶۰ء میں فرانس کے ایک نامہ نگار نے الجزائر کے ایک مقام پر نظربندوں کے کیمپ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اس کیمپ میں مقید تمام مسلمانوں نے بیک آواز کہا کہ وہ آزادی کی جنگ جاری رکھنے اور لڑ کر آزادی حاصل کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ بے غیرتی کے امن کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ آخرکار ۱۹۶۲ء میں فرانس کے آنجہانی صدر ڈیگال

بومدین اور اس کے ممکنہ جانشین

پہلی قطار (دائیں سے بائیں)

کرنل احمد بن شریف، کرنل صالح یحییٰ، عبدالعزیز تفلیکہ

دوسری قطار ″ ″

کرنل عبداللہ بالحوث، کرنل شادلی بن جدید، میجر احمد دریا

تیسری قطار میں

رباہ تبات، محمد طیبی لاربی، کرنل محمد عبدالغنی

ان میں سے جس شخص کو بھی بومدین کی جانشینی کا اعزاز نصیب ہوا، اُسے حکومت کرنے کے لیے سیاسی اور معاشی اعتبار سے مستحکم الجزائر ورثے میں ملے گا۔

نے الجزائری عوام کے حقِ خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی اس پالیسی سے انحراف کرنے والے فرانسیسی فوجی افسروں کی تطہیر شروع کردی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک فرانسیسی فوج کے خلاف جنگ کے دوران میں لاتعداد الجزائری حریت پسندوں نے جامِ شہادت نوش کیے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں فرانس نے الجزائر میں ریفرنڈم کروایا اور اکثریت نے آزادی کے حق میں ووٹ دیے۔ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو الجزائر کی آزادی کا اعلان کیا۔ اگست ۱۹۶۲ء میں احمد بن بیلا ملک کے صدر اور وزیرِاعظم اور حواری بومدین نائب صدر اور وزیرِ دفاع مقرر ہوئے۔

جون ۱۹۶۵ء میں صدر بن بیلا اور نائب صدر و وزیرِ دفاع بومدین کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے، جس کے تحت الجزائر میں انقلاب آیا اور بن بیلا کو صدارت سے ہٹا دیا گیا۔ بومدین ملک کے سربراہ اور حکمران انقلابی کونسل کے چیئرمین اور وزیرِاعظم منتخب ہو گئے۔

صدر بومدین نے ملک کی انتظامیہ سوشلسٹ بنیادوں پر استوار کیا۔

صدر بومدین نے ۲۲ فروری کو لاہور میں دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس میں مسلم ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہا: "اس کے بغیر مسلمان ممالک بدستور دوسروں کے محتاج رہیں گے۔ انسانی تجربے نے دُنیا کے متعدد ممالک پر ثابت کردیا ہے کہ غربت و افلاس اور جہالت کے شدید تھپیڑوں کی موجودگی میں صرف مذہبی رشتے خواہ اسلام پر ہوں یا عیسائیت کی بنیاد پر ہوں کافی نہیں ہیں"۔

صدر بومدین نے مسلم ملکوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمان کمزور رہیے تو وہ اپنا حق خواہ وہ کتنا ہی منصفانہ اور جائز ہی کیوں نہ ہو، نہیں لے سکتے۔ مسلمان ممالک مل کر ایسی تیسری دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی لڑائی صنعتی دنیا کے خلاف ہے۔

نئے الجزائر کے قائد کی میت

چین کے بند معاشرے میں تازہ ہوا کے لیے دریچے کھل گئے

چین کی دیواریں گزشتہ چند ہفتوں سے ایک مخصوص آمرانہ نظام کے خلاف پوسٹروں سے ہر صبح نئے انداز سے مزین ہو جاتی ہیں۔ ان پوسٹروں پر جمہوریت زندہ باد، آمریت مُردہ باد، حکومت کو جدید بنیادوں پر استوار کرو جیسے نعرے درج ہوتے ہیں۔

ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد نئے حکمرانوں نے آزادئ اظہار کی اجازت دے کر ایک دردسری مُول لے لی ہے، لیکن اس سے ایک چوتھائی انسانیت کی اس خواہش کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایک بند معاشرے سے باہر نکل کر کھُلی فضاؤں میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ اس خواہش سے یہ منطقی نتیجہ بھی سامنے آیا کہ لوگوں کو مصنوعی خول میں بند نہیں کیا جا سکتا اور اشتراکیت (خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو) انسان کو مستقل طور پر پابہ زنجیر نہیں رکھ سکتی۔

چین میں اس سے پہلے بھی لوگوں نے آزادی کی خواہش کی تھی، مگر ثقافتی انقلاب کے نام پر اور عوام دشمنی کا لیبل لگا کر ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آج چین کے اندر وہ لوگ حکمران ہیں، جنہیں ثقافتی انقلاب میں دبا دیا گیا تھا۔ انہی کی وجہ سے لوگوں کو کچھ ہمت ہوئی ہے کہ وہ اپنی سوچ کو عام کر سکیں اور اس کا ایک نادر طریقہ انہوں نے یہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ راتوں رات دیواریں سیاہ کردی جاتی ہیں اور صبح لوگوں کا ایک جمِ غفیر ان پوسٹروں پر یوں نظریں جمائے کھڑا نظر آتا ہے کہ وہ اپنی دن بھر کی معروفیات تک بھول جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ٹریفک جام ہو جاتی ہے اور دفتروں کا نظام معطل۔

آزادئ اظہار کی حدیں وسیع ہو رہی ہیں۔ ایک چینی نے کہا: "ہم ماؤ کی غلطیوں پر بھی تنقید کریں گے اور اگر ہمیں کسی جانب سے زبردستی خاموش کرانے کی کوشش کی گئی، تو ہم تنگ کی قیادت میں ہر شکل کا مقابلہ کریں گے، حتیٰ کہ ہم اپنے مقصد کو پالیں۔" چین کے نائب وزیرِاعظم آزادی پسند گروہ کے قائد تصور کیے جاتے ہیں۔

ان کا بھی کہنا ہے کہ چین ابھی تک ایک قدامت پرست ملک ہے۔ اسے فوری طور پر جدید بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ تنگ ایک منظم پالیسی کے تحت ملک کو مغربی اقدار سے روشناس کرا رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی درآمد کی جا رہی ہے۔ مغربی ملکوں سے اسلحے کی خرید جاری ہے اور کل کے دشمنوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جا رہا ہے۔ فضا اسی طرح قائم رہی تو آئندہ عشرے میں چین مکمل طور پر ایک نئے متحرک نظام سے روشناس ہو چکا ہوگا۔

دیواریں کیا پیغام دیتی ہیں؟

اسد اللہ غالب

نئے وفاقی علاقے کے قیام کی منصوبہ بندی

باخبر حلقوں سے پتہ چلا ہے کہ اسلام آباد، راولپنڈی شہر، راولپنڈی چھاؤنی اور واہ کینٹ کے علاقے پر مشتمل نئے وفاقی علاقے کے قیام کا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ کابینہ کے گزشتہ اجلاس میں اس پر گرما گرم بحث ہوئی۔ "زندگی" کو ملنے والی اطلاعات کے مطابق وفاقی وزیر تجارت جناب زاہد سرفراز نے اپنے انداز مخصوص میں اس کی مخالفت کی۔ ان کے پاس ایک دلیل وزنی تھی کہ اگر وفاق نے کسی صوبے سے کوئی خاص علاقہ تحویل میں لینا ہو، تو اس کے لئے اسمبلی کا فیصلہ ضروری ہے۔ اس کے برعکس وفاقی وزیر قانون جناب اے کے بروہی نے یہ رائے دی کہ قانونی طور پر یہ اقدام کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بہرحال اس سکیم پر غور کرنے کے لئے کابینہ کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے جس کے سربراہ وفاقی وزیر دفاع جناب میر علی احمد تالپور ہیں۔

قومی حلقوں کے لئے یہ خبر یقینی طور پر تشویش کا باعث ہوگی، کیونکہ اس سے بے انتہا انتظامی اور مالی پیچیدگیاں جنم لینے کا اندیشہ ہے۔

ایران میں موجود امریکی اسلحہ اسرائیل منتقل ہو رہا ہے

ایران کا داخلی بحران سنگین تر صورت اختیار کر چکا ہے اور اب اس کے اثرات بیرونی دنیا تک وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ مشہد میں ایرانی فوج نے جس بے دردی سے مظاہرین کو ٹینکوں تلے روند ڈالا، جدید دور میں اس بہیمیت کی مثال ملنی مشکل ہے۔ دوسری طرف غیر ملکیوں کا انخلاء تیزی سے جاری ہے۔ تہران کا بین الاقوامی اڈہ قیامتِ صغریٰ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ کبھی کوئی طیارہ اترتا ہے، تو لوگ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ بچے ماؤں سے جدا ہو جاتے ہیں اور خواتین اپنے مال اسباب پر نگاہِ حسرت ڈالتی ہیں کہ پھر کب لوٹنا نصیب ہو۔ اسی ہنگامے میں اسرائیل کے دیو ہیکل ٹرانسپورٹ طیارے بھی تہران ایئرپورٹ پر اتر رہے ہیں اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق ایران میں امریکہ کی جدید ترین دفاعی تنصیبات اور اسلحہ دھڑا دھڑ اسرائیل منتقل کیا جا رہا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں، بلکہ شنید یہ ہے کہ ایرانی فوج کا ایک مؤثر حصہ اسرائیلیوں پر مشتمل ہے۔ ایرانی عوام کے خلاف درندگی اور بہیمیت کا مظاہرہ اسی گروہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

الطاف حسن قریشی کیلئے اعزاز

۱۹۷۸ء کے لئے عمر شیخ فاؤنڈیشن گولڈ میڈل جناب الطاف حسن قریشی کو دیا گیا ہے۔ یہ بات عمر شیخ فاؤنڈیشن لندن کے سرپرست مولانا اسد قادری نے لندن سے لاہور پہنچنے پر بتائی۔ عمر شیخ فاؤنڈیشن نے ۱۹۷۵ء میں تمغہ رائج کیا تھا۔ یہ تمغہ اسلام کی سب سے زیادہ مؤثر خدمت کرنے والے پاکستانی صحافی کو ہر سال دیا جاتا ہے۔ مولانا اسد قادری نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت کو پاکستان کے بہترین مفکروں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو تمغے اور اعزازات دینے چاہئیں۔ فاؤنڈیشن کی طرف سے گزشتہ برس یہ تمغہ "جسارت" کے ایڈیٹر جناب صلاح الدین کو دیا گیا تھا۔

اہنسا اور غیر جانبداری کے دعویدار ملک بھارت کے شہر علی گڑھ میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ فسادات اس قدر شدید تھے کہ جامع مسجد میں عید کی نماز بھی ادا نہ ہو سکی۔

پاکستانی سائنس دان کی پیش کش

ہم ملک کے اندر ری پراسیسنگ پلانٹ بنا سکتے ہیں

کینیڈا میں ایٹمی ری ایکٹر ڈیزائن کرنے والی ایک فرم میں ایٹمی طبیعات کے ایک پاکستانی ماہر جناب ڈاکٹر پرویز نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ لاہور آئے۔ "زندگی" کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے پیشکش کی کہ اگر حکومتِ پاکستان مناسب سہولتیں فراہم کرنے کی ذمّے داری قبول کر لے، تو پاکستانی سائنس دان خود ملک کے اندر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ بنا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم فرانس اور امریکہ کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر پھرنے سے بچ جائیں گے اور ساتھ ہی مغربی ممالک ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں نہ رہیں گے۔ ڈاکٹر پرویز صاحب نے خبردار کیا کہ دنیا میں ایندھن کے وسائل جس تیزی سے ختم ہو رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر پاکستان کو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی شدّت سے ضرورت ہے تاکہ ہم آنیوالے عشرے میں ایندھن کے بحران کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو سکیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھارت اور امریکہ کے اس واویلے کو مضحکہ خیز قرار دیا کہ پاکستان ایٹمی اسلحہ بنانے کے لئے ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ زرعی، صنعتی، طبّی اور معاشی میدان میں قدم قدم پر ایٹمی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے اور پاکستان ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے انہی میدانوں میں درپیش چیلنج قبول کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک ایٹم کے جنگی استعمال کا تعلق ہے، ایک دنیا "ہیروشیما" اور "ناگا ساکی" میں اس کے بھیانک اثرات کو دیکھ چکی ہے اور نسلِ انسانی آئندہ ایسا تجربہ کرنے کی آرزو نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر پرویز صاحب نے پاکستان میں "ایٹمی ترقی" کو ناکافی قرار دیتے ہوئے سابق وزیرِ اعظم مسٹر بھٹو کے ان دعووں کو سراسر جھوٹ قرار دیا کہ ان کے دور میں پاکستان ایٹمی قوّت بننے کی حدود کو چھو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ایک ابتدائی اقدامات کے سوا پاکستان نے ایٹمی قوّت کی جھلک تک نہ دیکھی تھی۔

ڈاکٹر پرویز واپس کینیڈا پرواز کر گئے ہیں۔ وہ ایکسپریس کمرشل فنانس انٹرنیشنل کے پریذیڈنٹ مسٹر احسان بٹالوی کے برادرِ نسبتی ہیں اور اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بیمار معیشت کی بحالی کے لیے نجی شعبے میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی میں مصروف ہیں۔

رُوس کی دوستی کے معاہدے جارحیت کا سبب بنتے ہیں

افغانستان اور روس کے درمیان گذشتہ ماہ بیس سالہ دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوئے، تو عالمی حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ تاریخ کے سبق ہمارے سامنے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے وسط میں رُوس نے بھارت کے ساتھ اس قسم کا دوستی کا معاہدہ کیا اور چند مہینوں کے اندر بھارت، پاکستان کے خلاف ننگی جارحیت پر اُتر آیا اور مشرقی پاکستان پر اس نے مسلح یلغار کر دی جس کے نتیجے میں پاکستان کا یہ بازو کٹ گیا۔ گذشتہ برس رُوس نے اس قسم کا معاہدہ ایتھوپیا سے کیا، تو اس نے ہمسایہ ملک صومالیہ پر چڑھائی کر دی اور اس خطے کا امن ایک سال سے درہم برہم ہے۔ اس طرح رُوس اور ویت نام کے درمیان دوستی کا یہی معاہدہ ہوا، تو دنوں کے اندر ویت نام نے کمبوڈیا پر مسلح حملے شروع کر دیے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کمبوڈیا کی حکومت کو اپنے دفاع میں عوامی جنگ کا اعلان کرنا پڑا ہے۔ سیاسی مبصرین سوچ رہے ہیں کہ کیا کابل اور ماسکو کا معاہدۂ دوستی کسی نئی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

جنوبی ترکی کے قصبے قہرمان مارس میں فسادات کے شعلے بھڑکے اور کئی صوبوں میں پھیلتے چلے گئے۔ ترک فوج کی کارروائی سے پہلے ۱۰۴ افراد ہلاک کر دیئے گئے اور ایک ہزار زخمی ہوئے۔ وزیراعظم بلند ایجوت نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "قہرمان میں جو کچھ ہوا، اسے قتلِ عام کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

ترکی کے فسادات اُس وقت شروع ہوئے جب قہرمان میں بائیں بازو کے عناصر نے اپنے ہی گروپ کے دو مقتول اساتذہ کے جنازے اٹھائے اور دائیں بازو کے عناصر کو اشتعال دلایا۔ اگلے روز دائیں بازو کے لوگ گلیوں، بازاروں میں نکل آئے اور انتقام! انتقام! کے نعرے گونجنے لگے۔

وزیراعظم ایجوت مغربی جمہوریت کے مداح ہیں، مگر حالات اس قدر خراب تھے کہ انہیں کئی صوبوں میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ بعض ناقدین نے الزام عائد کیا ہے کہ وزیراعظم نے سُستی کا مظاہرہ کیا۔ چند روز بعد وزیر داخلہ کو استعفےٰ دینا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ دو ماہ بعد جب مارشل لا اٹھا یا جائے گا، تو کیا فسادات کے اسباب ختم ہو چکے ہوں گے؟

تیل کی پیداوار میں اضافہ

پٹرولیم کی وفاقی وزارت کے ایک ترجمان کے اعلان کے مطابق گذشتہ چھ ماہ کے دوران پاکستان کی تیل کی پیداوار میں ۲۴ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ حکومت تیل کی تلاش کرنے اور کھدائی کے کام کو ترقی دینے کے لئے آئندہ سال بھی اپنی بھرپور کوشش جاری رکھے گی۔ ترجمان نے بتایا کہ گذشتہ سال جون میں خام تیل کی اوسط پیداوار ۹۰۲۷ بیرل روزانہ تھی جس میں سے پاکستان آئل فیلڈز لمیٹیڈ کی پیداوار ۷۵۸۹ بیرل روزانہ اور آئل اور گیس ترقیاتی کارپوریشن توت کے تیل کنوؤں کی پیداوار ۱۴۴۸ بیرل روزانہ رہی۔ موجودہ پیداوار ۱۱۲۰۰ بیرل روزانہ ہے۔ اس میں سے ۹۴۰۰ بیرل روزانہ او جی ڈی سی کے تحت تیل کے کنوؤں سے ہے۔ پی او ایل کے تیل کے کنویں میال، بلکسر، ڈھلیاں اور جویا میر میں واقع ہیں۔ ترجمان نے بتایا کہ اگر مطلوبہ پیداوار میں کمی پائی گئی، تو پانچ روپے فی بیرل کے حساب سے جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، یہ تجویز کیا گیا ہے کہ توت کے تیل کے کنوؤں کی مجموعی پیداوار میں ۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۱ء تک دس ہزار بیرل روزانہ تک کا اضافہ کر دیا جائے۔ مستقبل کے امکانات کے بارے میں ترجمان نے کہا کہ پاکستان پٹرولیم لمیٹیڈ اور اموکو کی مشترکہ کوششوں سے ادھی کے مقام سے تین جگہوں سے حال ہی میں جو تیل دریافت ہوا ہے، اس سے پوٹھوہار کے علاقے میں تیل ملنے کے امکانات مزید روشن ہو گئے ہیں۔ اس علاقے میں متعدد آزمائشی کنوئیں کھودنے

کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ ترجمان نے مزید بتایا کہ توقع ہے کہ تیل اور گیس کی کارپوریشن تلہ گنگ سے دس میل دور دھرمند کے مقام پر ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو کھدائی کا کام شروع کر دے گی۔ اس طرح میال کے شمال میں میانوالہ کے مقام پر ایک آزمائشی کنوئیں کی کھدائی کا کام ۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء تک متوقع ہے۔ اسی طرح ایک اور آزمائشی کنواں ۱۹۷۹ء میں او جی ڈی سی کے اشتراک سے چکوال میں کھودا جائے گا۔

دریں اثنا وفاقی سیکرٹری پٹرولیم و قدرتی وسائل نے بتایا ہے کہ حکومت نے تیل کی تلاش کا کام تیز تر کر دیا ہے۔ ۱۹۷۹ء کا سال اس سمت میں اہم موثر ثابت ہو گا۔ انہوں نے یہ بات، سعودی عرب کے تین رکنی اعلیٰ اختیاراتی وفد کا استقبال کرتے ہوئے کہی جو ان دِنوں پاکستان کے دورے پر آیا ہوا ہے۔

"زندگی" کے قارئین ہمارے موقف سے بخوبی آگاہ ہیں اور افواہ ساز حلقوں کی اُمیدوں پر اس اعلان سے اوس پڑ گئی ہے۔

بے زبان افواہ

امریکی سی آئی اے کے ماہرین نے کمبوڈیا کے سابق سربراہ پرنس نارودم سہانوک کی ایک حالیہ تصویر کے معائنے کے بعد اس شک کا اظہار کیا ہے کہ سہانوک قوت گویائی سے محروم ہے۔ اس کی دلیل میں وہ یوگوسلاویہ کے سفیر اور سہانوک کی ملاقات کی مثال دیتے ہیں جس میں سفیر کو ملنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی گئی کہ وہ سہانوک سے کوئی بات نہ کرے گا۔ چین نے کئی بار یہ کوشش کی ہے کہ وہ سہانوک کو علاج کے لئے اپنے ہاں لے آئے، مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دراصل کمبوڈیا کے وزیراعظم پول پوٹ کا خیال ہے کہ سہانوک کی بیماری جعلی ہے اور وہ علاج کے بہانے ملک سے فرار ہونا چاہتا ہے۔

نام نہاد ریلوے مزدور لیڈر

عمر دین کی "عیاری"

"زندگی" نے اپنی ایک گذشتہ اشاعت میں نام نہاد مزدور لیڈر عمر دین کے چند خطوط شائع کئے تھے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ عمر دین اور چیئرمین ریلوے کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ پاکستان ریلوے کے قریبی ذرائع نے ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے "زندگی" کو بتایا ہے کہ چیئرمین کو خواہ مخواہ ملوث کیا گیا ہے اور عمر دین کی یہ سرشت ہے کہ وہ بالا افسروں کے نام پر ریلوے مزدوروں سے بھاری رقمیں بٹورتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ریلوے وزراء کی طرف سے بھی خط لکھتا رہا۔ بعض اوقات افسران بالا کو عمر دین کے چونچلے اس لئے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں کہ وہ سودا کاری ایجنٹ ہے۔ "زندگی" کو پتہ چلا ہے کہ عمر دین کی یونین کسی ریفرنڈم کے نتیجے میں سی بی اے قرار نہیں دی گئی تھی، بلکہ صنعتی تعلقات کے کمیشن نے اسے یہ پوزیشن عطا کی تھی۔ ریلوے حکام کی تجویز پر اب ریفرنڈم کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ مزدوروں کے رجحانات سے واضح ہوتا ہے کہ عمر دین کی یونین شکست کھا جائے گی۔

محمد عارف قریشی

جذبے سمندروں کی طغیانیاں لیے ہوئے تھے

ختمِ نبوّت کے پروانوں کا رُوح پرور اجتماع

چنیوٹ کانفرنس کی چشم دید رپورٹ

۲۶ ردسمبر کی صُبح لاری اڈہ چنیوٹ سے انسانوں کا ایک سیلاب لائبریری پارک کی طرف بہے جا رہا تھا۔ ایک تنکے کی مانند اس سیلاب میں بہتا ہوا میں لائبریری پارک میں پہنچا، تو اس وقت تحفظ ختمِ نبوّت کانفرنس کی پہلی نشست کا آغاز ہونے کو تھا۔ شمع ختمِ نبوّت کے پروانے جوق در جوق جلسہ گاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے دیہاتی وضع قطع کے ایک آدمی سے پوچھا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟" نوجوان نے ڈیرہ غازی خان کا نام لیا۔ اللہ رے جذبۂ شوق۔ ڈیرہ غازی خان چنیوٹ سے پورے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے اور یہ آدمی دسمبر کی سردی میں رات کو وہاں سے چلا ہو گا کہ صُبح ہی صُبح یہاں پہنچ گیا۔

لائبریری پارک میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ مجلس تحفظ ختمِ نبوّت کی انتظامیہ نے اپنا معلوماتی کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آگے خاکسار تحریک کے نوجوانوں کا خدمتِ خلق کیمپ لگا ہوا تھا اور اس سے آگے ایک بڑا سا شامیانہ اور اس کے اردگرد پردے لگا کر خواتین کی جلسہ گاہ بنائی گئی تھی۔ پارک کے شمالی جانب سینٹر میں سٹیج بنایا گیا تھا اور اس کے سامنے وسیع میدان کے آخر تک شامیانے تان کر پورے پارک کو ڈھک دیا گیا تھا۔ جلسہ گاہ کی ساری زمین پرالی سے چھپا دی گئی تھی۔ سٹیج پر دائیں طرف روسٹرم رکھا گیا تھا اور اس کے بائیں طرف تین بڑی کرسیاں رکھی تھیں اور ان کے پیچھے پانچ سات چھوٹی کرسیاں، جبکہ سٹیج کے دائیں اور بائیں طرف بھی زمین پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ سٹیج کی پیشانی پر ایک بینر لٹکا ہوا تھا جس پر "ہم تحریک ختمِ نبوّت کے شہدا اور مجاہدین کو سلام پیش کرتے ہیں" مرقوم تھا، جبکہ جلسہ گاہ کے چاروں طرف بھی مختلف نعروں اور عبارتوں پر مشتمل بینر لہرا رہے تھے۔ ان میں سے چند عبارتیں اس طرح سے ہیں۔

اسلام زندہ باد۔ تاج و تخت ختمِ نبوّت زندہ باد۔ قادیانیوں سے ۱۹۷۴ء کی آئینی ترمیم پر عمل کرایا جائے۔" وغیرہ وغیرہ

جلسہ گاہ کے اردگرد ایستادہ کئی خاکسار بازوؤں پر مخصوص بلّے باندھے اور بیلچے اُٹھائے امن و امان کو بحال رکھنے میں مدد دینے اور باہر سے آنے والوں کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

اس سہ روزہ کانفرنس کے مجموعی طور پر نو اجلاس ہوئے جن میں کوئی سو سے زائد علماء، مشائخ اور سیاسی رہنماؤں نے خطاب کیا۔ ان میں دیوبندی بھی شامل تھے اور بریلوی بھی۔ اہلِ حدیث بھی تھے اور شیعہ بھی؛ البتہ بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء کی تعداد خاصی کم تھی، بلکہ اس فرقہ کے کسی معروف رہنما نے کانفرنس میں شرکت نہ کی۔ اس سلسلے میں جب مجلس کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا گیا، تو اس کے مرکزی مبلغ اور رکن مجلس شوریٰ مولانا منظور احمد شاہ نے بتایا! "مولانا شاہ احمد نورانی، عبدالستار نیازی اور اکبر ساقی کو ہم نے دانستہ دعوت نہیں دی، کیونکہ یہ ایک مشترکہ سٹیج ہے اور ان حضرات کی زبان سے آج کل سوائے قومی اتحاد پر بے جا تنقید کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ مقدس فضا کسی ہنگامے کی نذر ہو کر اپنا تقدس کھو بیٹھے جبکہ دیگر تمام بریلوی قائدین کو مدعو کیا گیا تھا۔ خواجہ قمر الدین سیالوی نے ہمیں جواب میں لکھا کہ انہیں ہمارے مقاصد سے کامل اتفاق ہے، لیکن وہ مصروفیت کے باعث کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکتے۔ تقریباً اسی مضمون پر مشتمل جواب صاحبزادہ فیض الحسن کی طرف سے آیا کہ وہ کمزوری اور ضعیفی کے باعث کانفرنس میں شرکت سے معذور ہیں۔ محمود شاہ صاحب گجراتی نے اپنی شرکت کی وجہ اپنی بیماری کو بتایا اور پیر کرم شاہ بھیروی نے کہا کہ انہیں انہی دنوں میں ایک سفر درپیش ہے، اس لئے وہ چنیوٹ آنے سے قاصر ہیں۔ ان تمام حضرات نے اپنے خطوط میں ہمیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے اور ہماری کامیابی کے لئے دعا کی ہے۔ ہاں پیر صاحب گولڑہ شریف معین الدین نے لکھا ہے کہ ختمِ نبوّت کے مسئلہ پر میں کاملاً آپ سے متفق ہوں، لیکن میں جلسے جلوسوں کا قائل نہیں"۔ اسی لمحے مجھے مولانا منظور احمد چنیوٹی کا خیال آیا جنہیں اب سے پہلے اس کانفرنس کی روحِ رواں سمجھا جاتا تھا، لیکن اس دفعہ مُقررین میں اُن کا نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ میں نے اس سلسلے میں منظور احمد شاہ صاحب سے استفسار کیا، تو وہ چونک پڑے اور کہا: "اس ضمن میں یہ خیال کرنا کہ ہمارے مولانا منظور سے کوئی اختلافات ہیں، قطعاً بے بنیاد ہے۔ اصل مسئلہ وقت کی قلت اور مقررین کی بہتات ہے، اب آج ہمارے پاس کوئی دوسو کے قریب خطباء پہنچ چکے ہیں اور وقت ہمارے پاس صرف ایک دن ہے۔ ان حالات میں اگر چنیوٹی صاحب کے خطاب کے لئے وقت نہ نکالا جا سکے، تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ہم نے انہیں نظر انداز کیا ہے"۔

یہ مُلک کا واحد پلیٹ فارم ہے جس پر مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے رہنما جمع ہوتے ہیں اور نبوّت کے نقب زن کے خلاف مشترکہ جہاد کے وعدے کا اعادہ کرتے ہیں، عوام کو مرزائیت کے عزائم سے روشناس کراتے ہیں اور لوگوں کے سینوں کو آقائے دوجہاں کے نور سے منوّر کرتے ہیں، لیکن اس دفعہ کچھ مقررین پٹڑی سے اُتر گئے اور انہوں نے اپنے سیاسی اختلافات کو ختمِ نبوّت کے اس مقدس سٹیج پر لا کھڑا کیا۔ خصوصاً خاکسار تحریک کے قائد خان محمد اشرف خان تو قومی اتحاد کے سربراہ، اُن کے رفقائے کار اور وزراء سے سخت برافروختہ تھے۔ انہوں نے نظامِ مصطفےٰ کو بہانہ بنا کر اتحاد سے بڑی بیزاری کا اظہار کیا، جبکہ اکثر مقررین نے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قوم کے زیادہ سے زیادہ اتحاد پر زور دیا اور اس اتحاد میں انتشار پیدا کرنے کے ذمّہ داروں کی مذمت کی کہ اتحاد ہی کی بدولت مسلمانوں کو یہ کامیابی نصیب ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے اندر گھسے ہوئے استعماری ایجنٹوں کو اقلیت قرار دلوا کر اُن کی نشاندہی میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

کچھ اور لوگوں نے بھی اپنے خطاب میں خان اشرف خان کی مُبہم انداز میں تقلید کرنے کی کوشش کی جن میں اہلحدیث کے رہنما احسان الٰہی ظہیر اور بریلوی مکتبۂ فکر کے مولانا غلام رسول شامل ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے دو معروف رہنماؤں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ فیصل آباد کے امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل احمد ضیاء اور سیکرٹری جنرل جماعتِ اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد۔ ان دونوں حضرات نے ختمِ نبوّت کے مسئلہ کو بڑے دلنشین انداز میں واضح کیا اور قوم میں فرقہ بندی کی مذمت کی۔ باہمی اتحاد پر سب سے زیادہ زور شیعہ علماء نے دیا خصوصاً آغا سے مرتضےٰ پویا اور علی غضنفر کراروی۔ قومی اتحاد کے دو قائدین بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے، یعنی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود اور نائب صدر نوابزادہ نصر اللہ خان۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے بڑے مؤثر اور عام فہم انداز میں قادیانیت کا پس منظر بیان کیا اور مولانا مفتی محمود نے بڑے خوبصورت طریقے سے خان اشرف اور احسان الٰہی ظہیر کی اتحاد پر تنقید کا جواب پیش کیا۔ دو صحافیوں نے بھی اس سٹیج کے مقررین میں اپنا نام لکھوالیا۔ یعنی ہفت روزہ "خدام الدین" کے ایڈیٹر سعید الرحمٰن علوی اور ہفت روزہ نقیبِ ملت کے ایڈیٹر مسٹر اختر کاشمیری کانفرنس کی خاص بات اس میں ایک وفاقی وزیر کی شرکت تھی۔ یہ وفاقی وزیر سائنس اور ٹیکنالوجی مسٹر ارشد چودھری تھے۔

جبکہ جزائر فجی سے آئے ہوئے محمد حنیف خان اور محمد قیوم اور برما کے نمائندے نے بھی اس مقدس اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کر لی۔

کانفرنس میں مجموعی طور پر ۵۰ ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ جلسہ گاہ میں گنجائش نہ رہتی، تو لوگ پارک کی چار دیواری پر چڑھ بیٹھتے یا اس کے ارد گرد سڑکوں پر پھیل جاتے۔ دور دراز سے آئے ہوئے ہزاروں لوگوں کے قیام کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں کئی مہمان خانے بنائے گئے تھے۔ یہ مہمان خانے چنیوٹ کے صاحب ثروت اور مخیر لوگوں کے مکانوں میں قائم کئے گئے تھے۔ ان لوگوں نے بلا حیل و حجت اپنے مکان خالی کرا دیے اور تین روز تک ان کے استعمال کا کوئی کرایہ وصول نہ کیا۔ اکثر مہمان بستر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اہل چنیوٹ نے بڑی خوشدلی سے مہمانوں کا استقبال کیا اور انہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کی۔ مختلف اشیائے ضروریہ کے نرخ ان دنوں حسبِ معمول رہے، بلکہ کہیں کہیں تو کانفرنس کے شرکاء کو خصوصی رعایت کا فائدہ بھی دیا گیا۔ انہیں ہر طرح کا تعاون پیش کیا گیا۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت متوسط، بلکہ غریب اور دیہاتی لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے تین روز کا لا پرائی بچھے گراؤنڈ پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے تمام تقریریں سنیں۔ سامعین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ جب بھی کسی نئے مقرر کے سٹیج پر آنے کا اعلان کیا جاتا، پنڈال مختلف نعروں سے گونج اٹھتا۔ ان میں سے کچھ نعرے اس طرح سے ہیں۔ اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔ نعرۂ رسالت یا رسول اللہ۔ نعرۂ حیدری یا علی رضؓ۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے نعروں کے اس انداز پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور اسے فرقوں کا مقابلہ قرار دیا۔ اس کے باوجود نعرے بند نہ ہوئے۔ ایک دو دفعہ کچھ لوگوں نے اس کے بجائے تالی بجانے کی کوشش کی، تو سٹیج سیکرٹری نے اس پر سخت اعتراض کیا جس پر بعد میں کسی طرف سے یہ حرکت نہ ہوئی۔ اسے انتظامیہ کی کمزوری کہیے یا لوگوں کا جذبہ کہ جب بھی کسی اہم شخصیت کے جلسہ گاہ میں داخل ہونے کا پتہ چلتا، لوگ اٹھ کھڑے ہوتے بلکہ کچھ تو سٹیج پر جا چڑھتے۔ خصوصاً مفتی صاحب کی آمد کے وقت تو مجمع ایک دم جوش میں آگیا۔ تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور مفتی صاحب تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ نعروں کا عالم یہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چند نعرے جو اس وقت سمجھ میں آئے، اس طرح سے ہیں۔ جیوے جیوے مفتی جیوے، آوے ای آوے مفتی آوے، فاتح بھٹو زندہ باد، مفتی اعظم زندہ باد وغیرہ وغیرہ۔

یہ نعرے اس قدر طول کھینچ گئے کہ مفتی صاحب کو اپنی تقریر کے آغاز کے لیے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ جوشیلے نوجوانوں کو بار بار زبردستی بٹھایا جاتا، لیکن وہ پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور نعرے لگانے لگتے۔ اس کے علاوہ سامعین نے ہر مقرر کو دمکتے چہروں اور پرجوش نعروں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ ان کے قابل داد فقروں پر دل کھول کر داد دی اور مرزائیت سے اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کیا۔ ایک بات خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ جب کوئی مقرر اتحاد کو مضبوط بنانے پر زور دیتا، تو لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے وہ اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگتے، لیکن جب کوئی قومی اتحاد یا اس کی حکومت میں شمولیت پر تنقید کرتا، تو ان کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات ابھر آتے۔ غالباً مقررین نے بھی عوام کے جذبات کو محسوس کر لیا تھا، کیونکہ ان تین دنوں میں مجموعی طور پر قومی اتحاد پر تنقید کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی بات کی اور اپنی تقریروں کو خاتم الانبیاء کا مرتبہ بیان کرنے اور قادیانیت کے بخیے ادھیڑنے تک محدود رکھا۔

کانفرنس کے پہلے روز کی آخری نشست میں خطبۂ صدارت بھی پیش کیا گیا۔ مجلس کے صدر مولانا خان محمد سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں کی طرف سے یہ خطبہ مجلس کی شوریٰ کے رکن مولانا تاج محمود ایڈیٹر "لولاک" فیصل آباد نے پڑھا۔ اس خطبہ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کا تعارف کرایا گیا اور تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں مجلس کی کامیابیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجلس تحفظ ختم نبوت کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ ان کے بعد مجلس کی قیادت بالترتیب ان مجاہدینِ اسلام کے ہاتھوں میں رہی۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر اور مولانا یوسف بنوری۔

حضرت بنوری کے وصال کے بعد جماعت کا نیا انتخاب عمل میں آیا اور امارت کے لیے قرعۂ فال حضرت مولانا خان محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں کے نام پڑا، جبکہ مولانا محمد عبداللہ صاحب جامعہ رشیدیہ ساہی وال کو نائب امیر، مولانا عبدالرحیم اشعر کو ناظم اعلیٰ، مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری خلف الرشید مولانا محمد علی جالندھری کو خازن اور مولانا محمد شریف جالندھری کو ناظم تبلیغ منتخب کیا گیا۔

اس کے علاوہ صدرِ مجلس کی طرف سے ۱۲۳ ارکان پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ نامزد کی گئی جس میں جماعت کے پرانے کارکنوں اور رہنماؤں کو رکھا گیا ہے، جبکہ ۴۰ اصحاب مجلس کے مبلغین کے طور پر ملک کے مختلف حصوں میں بھولے بھالے لوگوں کو مرزائیت کے چنگل سے بچانے کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مجلس تحفظِ ختمِ نبوت نے اپنے قیام سے لے کر آج تک مرزائیوں کے ہر چیلنج کو قبول کیا ہے۔ اس سلسلے میں جماعت نے حسبِ توفیق عربی، انگریزی، اردو اور سندھی میں بے شمار لٹریچر چھپوا کر اندرون اور بیرون ملک پھیلایا ہے۔ مجلس کا ترجمان ہفت روزہ "لولاک" زیرِ ادارت مولانا تاج محمود تمام مرزائی رسائل و جرائد کے پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ مجلس نے مختلف بیرونی ممالک میں اپنے تبلیغی وفود بھیجے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ، انڈونیشیا، افریقہ، مغربی جرمنی، انگلستان اور جزائر فجی میں مستقل طور پر اپنے مراکز قائم کر دیئے ہیں۔

مرزائیت کے خلاف تحریک ۱۹۷۴ء کے تمام اخراجات مجلس تحفظ ختم نبوت نے برداشت کیے تھے اور اس سے پہلے ۱۹۵۳ء کی تحریک بھی مجلس کا اعجاز ہے۔ جنوری ۱۹۷۵ء میں ربوہ میں مسلمانوں کی نمازِ جمعہ کی ابتدا ہوئی۔ پہلے یہ نماز مجسٹریٹ کی عدالت کے احاطے میں پڑھی جاتی تھی، اب مسجد محمدیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور ہر جمعہ کو وہاں ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ مجلس کا صدر دفتر ملتان میں ہے۔

قراردادیں

سہ روزہ ختمِ نبوت کانفرنس چنیوٹ کے مختلف اجلاسوں میں درج ذیل قراردادیں پیش کی گئیں جن کو بھاری اکثریت سے منظور کر لیا گیا:

۱۔ پہلی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ قادیانی قومی اسمبلی کے فیصلے سے منحرف ہو چکے ہیں، انہیں آئین کا باغی قرار دے کر ان کو قرار واقعی سزا دی جائے اور ان کا تمام لٹریچر جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے، فوری طور پر ضبط کر لیا جائے۔

۲۔ دوسری قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ربوہ کو چنیوٹ میں شامل کر کے ایک انتظامی یونٹ بنایا جائے اور ربوہ ریلوے سٹیشن کا نام تبدیل کرے، محکمہ مال کے ریکارڈ کے مطابق ڈھگیاں رکھا جائے۔

۳۔ تیسری قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ انتخابی فہرستوں میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کو ظاہر کرنے والی تحریر کو تبدیل کر کے حکومت کو ایک کروڑ روپے کا نقصان پہنچانے والوں کا پتہ چلایا جائے اور یہ رقم ان سے وصول کی جائے۔

۴۔ چوتھی قرارداد میں تمام مسلمان فرقوں میں اتحاد اور ہم آہنگی پر زور دیا گیا۔

۵۔ پانچویں قرارداد میں کریسنٹ گروپ آف انڈسٹری پاکستان کے صدر حاجی محمد شفیع مرحوم کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

۶۔ چھٹی قرارداد میں ربوہ میں مقیم تعلیمی اور دوسرے سرکاری اداروں کے ملازمین کی پریشانی پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اسلامیات کے پروفیسر کو جو قادیانی ہے، تبدیل کیا جائے۔

۷۔ ساتویں قرارداد میں کہا گیا کہ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ۱۲ ربیع الاوّل کو جن اسلامی احکامات کے نفاذ کا اعلان کیا جانا ہے، یہ اجلاس اس کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے اور اسے قومی اتحاد اور مولانا مفتی محمود کی کوششوں کا صلہ سمجھتا ہے۔

یہ قراردادیں مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے رکنِ شوریٰ مولانا تاج محمود نے پیش کیں اور عوام نے ہاتھ کھڑے کر کے اور مختلف نعرے لگا کر ان کی منظوری دی۔

ضروری اعلان

بنکنگ اینڈ انشورنس سپلیمنٹ

جنوری ۱۹۷۹ء میں "زندگی" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہو رہا ہے۔ اشتہارات اور مضامین کی بکنگ کے لیے فوری رابطہ قائم کیجیے۔

ادارہ

چنیوٹ کانفرنس

چھبیس سال پہلے چنیوٹ میں ہر سال سہ روزہ ختم نبوت کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ کانفرنس باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہے۔ ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر اجلاس کی تاریخیں مقرر ہیں، انہی تاریخوں میں ربوہ میں مرزائیوں کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے۔

کانفرنس کی اختتامی نشست کے آخری مقرر فیصل آباد کے مولانا ضیاء القاسمی تھے جنہوں نے اپنی تقریر کو صرف سرور کائنات کی شان کے بیان تک محدود رکھا اور پھر ۱½ بجے رات جب یہ سہ روزہ کانفرنس اختتام پذیر ہوئی، تو پنڈال اسلام زندہ باد اور تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد گنجان شہر چنیوٹ کی روشن و تاریک گلیوں میں انسانوں کے ریلے بہہ رہے تھے۔ کہیں یہ ریلے پھیل جاتے اور کہیں سمٹ جاتے اور یوں رات کے پچھلے پہر تک چنیوٹ کی گلیاں محبانِ رسولؐ کے قدموں کی دھمک سے گونجتی رہیں۔

اس سے اگلے روز مجلس تحفظ ختم نبوت کی فتوحات کا جائزہ لینے کے لئے میں ربوہ گیا۔ چنیوٹ کے مغرب میں دریائے چناب بہتا ہے اور اس کے مغربی کنارے پر ربوہ ہے۔ ربوہ کے مشرقی جانب اس کے محلہ الف کے پہلو میں مسلم کالونی کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا، لیکن قادیانیوں نے اس منصوبے کو ختم کرانے کے لئے عدالت میں کیس دائر کر دیا جس کی وجہ سے کالونی کی تعمیر آج کل معطل ہے، البتہ اس کالونی میں صرف ۹ کنال کی جگہ مرکز ختم نبوت کے لئے الاٹ کر دی گئی ہے، اس کی تعمیر شروع ہے۔ دو کمرے اور برآمدہ مکمل ہو چکے ہیں۔ یہاں ٹیلیفون بھی لگ چکا ہے جس کا نمبر ۴۶۶ ہے۔

ریلوے سٹیشن ربوہ کے پہلو میں مسجد ختم نبوت کی عمارت تقریباً تکمیل کے قریب ہے، صرف فرش اور چار دیواری ابھی باقی ہے۔ یہ مسجد ۴ کنال کے احاطے میں واقع ہے اور یہ ریلوے کی جگہ ہے۔ تین سال سے اس مسجد میں نماز باجماعت اور درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ قاری شبیر احمد یہاں امامت اور تدریس اور مولانا اللہ وسایا نماز جمعہ پڑھانے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اللہ وسایا صاحب کو پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے اور قاری شبیر احمد کو ۳۵۰ روپے۔ دو بچے جو مؤذن کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور قاری صاحب کا کھانا پکانے کا بھی، انہیں الگ سے ۱۰۰ روپیہ دیا جاتا ہے اور یہ تمام اخراجات مجلس تحفظ ختم نبوت برداشت کرتی ہے۔ یہاں قائم کئے گئے درس میں تقریباً ۲۰ بچے زیر تعلیم ہیں، جن میں ۱۶، ۱۷ مقامی ہیں اور ۲، ۳ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ مقامی بچے زیادہ تر ریلوے ملازمین کے اور سٹیشن سے دو فرلانگ پر واقع بستی چمن عباس میں رہائش پذیر مسلمانوں کے ہیں۔ چمن عباس کے لوگ اس سردی میں بھی صبح اور عشاء کی نماز مسجد محمدیہ میں باجماعت پڑھنے کے لئے پہنچتے ہیں۔ یہاں کا معمول ہے کہ قاری صاحب روزانہ صبح کو لاؤڈ سپیکر پر قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ سنا ہے وہ قرآن بڑی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔ قادیانیوں نے ان کے اس معمول کو ختم کرانے کی مختلف ذرائع سے کئی کوششیں کی، لیکن ناکام رہے۔

اس کے علاوہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے قاری صاحب کو اپنے دام میں لانے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔

قاری شبیر احمد نے بتایا کہ ایک دفعہ ایک قادیانی نوجوان انکے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ قاری صاحب نے جواباً کیوں کہا، تو وہ کہنے لگا کہ آپ حافظِ قرآن ہیں اور ماشاء اللہ تلاوت بہت اچھی کرتے ہیں۔ میری دو نوجوان بہنیں ہیں اور دونوں قرآن کی حافظ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری ایک بہن کو اپنے عقد میں لے لیں، لیکن قاری صاحب نے یہ کہہ کر اسے مایوس کر دیا کہ نہ صرف یہ کہ میری شادی ہو چکی ہے بلکہ ۲ بچے بھی ہیں۔

اس کے علاوہ قاری صاحب کو وقتاً فوقتاً قادیانی نوجوانوں کی طرف سے دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ہمارے پاس آئیں، بیٹھیں، کسی خدمت کا موقع دیں، ہم آپ کے ہمدرد ہیں، جب کہ بعض اوقات بازار سے گزرتے ہوئے ان پر آوازے بھی کسے جاتے ہیں۔

قاری شبیر احمد نے ربوہ کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں مسلمان ملازمین کے لئے رہائش کا میسر نہ آنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ قادیانی کسی مسلمان کو مکان قیمتاً تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کرایہ پر بھی نہیں دیتے، جب کہ سرکاری طور پر ان کے لئے رہائش کا کوئی بندوبست نہیں۔ اسی بات کی شکایت ربوہ ریلوے سٹیشن کے سٹیشن ماسٹر عبدالرشید صاحب نے بھی کی۔ عبدالرشید صاحب نے بتایا کہ اگرچہ یہاں ریلوے ملازمین کو رہائش کی کوئی تکلیف نہیں، کیونکہ انہیں محکمہ کی طرف سے کوارٹر مہیا کئے جاتے ہیں، لیکن دوسرے محکموں کے ملازمین اس مسئلے سے دوچار ہیں، اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے سیکرٹری بلدیہ ربوہ کا ذکر کیا، جنہیں وہاں آئے ہوئے تقریباً ۴ ماہ ہونے کو ہیں، لیکن انہیں ابھی تک مکان نہیں ملا۔ شاید اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں۔

اسٹیشن کے ایک اور ملازم نے بتایا کہ اس دفعہ ربوہ کے جلسے کے سلسلے میں سپیشل سٹاف میں شیخ مبارک احمد نامی ایک سینئر ویجیلینس آفیسر لاہور سے تشریف لائے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک سیلون نمبر ،، ابھی لے آئے۔ یہاں انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت ڈیوٹی دینے کے بجائے جلسہ گاہ میں گزارا اور واپسی پر یہاں سے ٹی اے ڈی اے سٹیٹمنٹ بھی بنوا کر لے گئے۔

ربوہ میں دفتر جماعتِ اسلامی تقریباً ایک سال پیشتر قائم کیا گیا تھا۔ بڑی کوشش کے باوجود ربوہ شہر کے اندر دفتر کے لئے جگہ نہ مل سکی، تو شہر سے ملحقہ محلہ جھنگی قریشیاں میں جماعت کا دفتر قائم کیا گیا۔ یہ محلہ کمیٹی حدود کے اندر ہے۔ اس دفتر میں ایک ہمہ وقتی ناظم موجود ہوتے ہیں۔ دفتر کی طرف سے فری لٹریچر مہیا کیا جاتا ہے، نیز وہاں درسِ قرآن کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

جھلکیاں

۳۔ خاکسار تحریک کے رہنما خان اشرف خان نے کانفرنس میں خطاب سے پہلے اسی روز چنیوٹ کے منول ہال میں اپنی جماعت کے کارکنوں کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیے میں بھی تقریر کی تھی اور اس سے پہلے انہوں نے چنیوٹ بار کے ارکان سے خطاب کیا۔ ان کی یہ تینوں تقریریں ایک ہی موضوع بلکہ ایک ہی عبارت پر مشتمل تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے دو روز پہلے یعنی ۲۵ دسمبر کو قائدِ اعظم ڈے کے سلسلے میں منعقدہ جلسہ (بمقام دفتر جماعت اسلامی ۹ شارع فاطمہ جناح لاہور) میں انہوں نے جو تقریر کی، اس کے الفاظ بھی یہی تھے، گویا سٹیج چاہے قائدِ اعظم کا ہو یا ختم نبوت کا۔ ان کی تنقید کا رُخ قومی اتحاد کی طرف ہی ہو گا۔

۵۔۔ شیعہ رہنما مظفر علی شمسی کے صاحبزادے رضا علی شمسی اس کانفرنس کے سب سے کم عمر مقرر تھے۔ ان کی معصومیت اور تقریر کے ٹھہرے ٹھہرے انداز نے سامعین پر سحر طاری کر دیا۔ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنے والے رضا علی شمسی کی تقریر کانفرنس کی واحد تقریر تھی جو پوری کی پوری کاملاً خاموشی اور سکون سے سنی گئی۔

۸۔ کہتے ہیں ایک دفعہ گوہر جان نامی ایک طوائف اکبر الہ آبادی کے پاس گئی اور ان سے کہا!

"آپ نے سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے، میرے بارے میں کوئی شعر فرما دیں۔"

اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس کے "ارشاد کی تعمیل" میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

خوش نصیب کون ہے اور یہاں گوہر کے سوا
سب کچھ دے رکھا ہے اللہ نے شوہر کے سوا۔

نوابزادہ نصر اللہ خان نے یہ لطیفہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ اسی طرح تحریکِ استقلال کے قائد ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان صاحب کے پاس اور سب کچھ ہے، مگر استقلال نہیں۔

۱۰۔ ایک مقرر نے کہا کہ حکومت نے مرزائیت کی بیخ کنی کے لئے بہت کچھ کیا ہے، لیکن ہماری درخواست ہے کہ "ایک دھکا اور دو"۔ اس پر سارا پنڈال درج ذیل نعروں سے گونج اٹھا!

مرزائیوں کی دیواروں کو ایک دھکا اور دو
امریکہ کے غمخواروں کو ایک دھکا اور دو

۱۱۔ جزائر فجی سے آئے ہوئے محمد قیوم نے دو واقعات بیان کئے جو پاکستانیوں کو ان کی موجودہ حالت پر گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

جناب محمد قیوم نے کہا کہ جزائر فجی کے ایک سکول میں بچوں سے سوال کیا گیا کہ مسلمان حج کرنے کے لئے کہاں جاتے ہیں؟ تو جواب میں بچوں نے یک زبان ہو کر کہا! "پاکستان"!

محمد قیوم نے مزید کہا کہ ایک اور سکول میں ایک چھوٹی سی بچی نے ایک پاکستانی فلم جو ان دنوں وہاں لگی ہوئی تھی کا نام لیتے ہوئے پوچھا کہ فلم دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

میں نے (محمد قیوم نے) اسے کہا کہ اگر وہ فلم صاف ستھری ہے، تو اسے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر اس میں فحاشی کا کوئی عنصر ہے، تو اسے دیکھنا نہ صرف ناجائز ہے، بلکہ گناہ ہے۔

قیوم صاحب کہتے ہیں کہ اس پر بچی نے بھڑک کر کہا کہ وہ فلم کیسے فحش ہو سکتی ہے، وہ تو پاکستان سے آئی ہے۔

●●

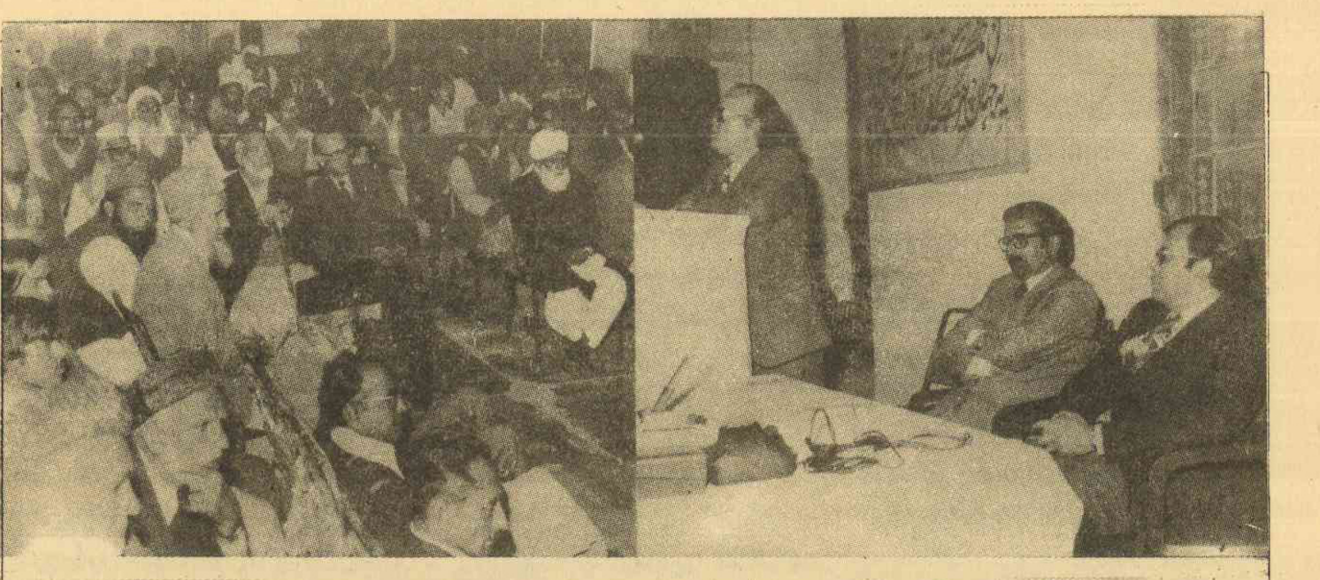

یومِ قائدِ اعظم کے موقع پر مسٹر الطاف حسن قریشی خطاب کر رہے ہیں

قائدؒ کے نظریات کی خوشبو عام ہو رہی ہے

ایاز قریشی نے یومِ قائدِ اعظمؒ کی ایک تقریب کا حال لکھا ہے

یہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں کئے گئے عملی اقدامات کا اعجاز ہے کہ اس بار ۲۵ دسمبر نرالی شان سے آیا۔ اہلِ بہاولپور کو ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ بانیٔ پاکستان کی یاد منانے میں اہلِ دانش سردمہری سے کام لیتے ہیں۔ اس بار قائدِ اعظم کا یومِ ولادت تقریبات کے ساتھ طلوع اور غروب ہوا۔ تقریبات کے جلو میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس دن کا کوئی لمحہ —— قائدِ اعظم کو یاد کئے بنا نہ گزرے گا۔

پولیس لائن کی مجلسِ مذاکرہ سے سپاسِ پاکستان کی تقریب تک اور بزمِ شاہین کے مذاکرہ سے آرٹ کونسل میں تصاویر کی نمائش تک نیشنل سنٹر کے اجلاس سے دونوں مسلم لیگوں کے زیرِ اہتمام جلسوں تک عجب سماں تھا۔ سپاسِ پاکستان اور بزمِ شاہین کے زیرِ اہتمام ایس۔ ڈی ہائی سکول کے ہال میں ایک یادگار مجلس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر اسد محمود علوی نے کی۔ مُلک کے نامور صحافی، ادیب اور شاعر جناب الطاف حسن قریشی مہمانِ خصوصی تھے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجمن صحافیان بہاولپور کے صدر مسٹر امجد قریشی نے انجام دیئے۔

مَیں اگر یہ کہوں کہ قائدِ اعظم کی تقریبات کا حاصل یہ مجلس تھی، تو بے جا نہ ہوگا۔ تقریباً دو بجے تقریب کا آغاز ہوا جو نمازِ مغرب تک جاری رہی۔ درمیان میں نمازِ عصر کا وقفہ ہُوا، تو تقریب کے تمام شرکاء نے باجماعت نماز ادا کی۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد ہدیۂ نعت اور پھر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول کے طالب علم راجہ ریاض نے ایک قومی نغمہ پیش کیا۔ بزمِ شاہین کے مرزا محمد یوسف اور طارق عمر نے بڑے پُرجوش انداز میں قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

انہوں نے کہا کہ آج تجدیدِ عہد کا دن ہے۔ خاص طور پر نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے مقاصد کو سامنے رکھ کر مُلک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کرے اور قائدِ اعظم کے اصولوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ ان کے بعد خالد فارانی نے انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب عبدالعزیز وطنی نے قائدِ اعظم کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ امریکہ میں پاکستان کے سابق کونسل جنرل مسٹر احسان الحق انور نے، جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرکردہ رہنما تھے، بڑے مؤثر اور باوقار انداز میں قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر سہیل اختر کے منظوم خراجِ عقیدت کے بعد مسلم لیگی رہنما اور صوبائی اسمبلی کے سابق رکن سید تابش الوری کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ ان کی پُرجوش اور پُرمغز تقریر نے ایک سحر طاری کر دیا۔

ان کا کہنا تھا کہ ہم نے اپنے عمل سے اس ملک کو قائدِ اعظم کے خوابوں کی تعبیر بنانے کے بجائے دو ٹکڑے کر دیا اور قائدِ اعظم نے اپنی ساری زندگی جن تعصبات کو ختم کرنے میں صرف کر دی، ہم نے پھر انہی بُتوں کو اپنے ذہن کے بُت کدوں میں سجا لیا ہے۔ آج کل پھر مختلف قسم کے فتنے کبھی لسانی تعصبات کے روپ میں اور کبھی قومیتوں کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نے قائدِ اعظم کے اصولوں کو فراموش کر دیا جس کے نتیجے میں ہم اب تک اس ملک کو حقیقی معنوں میں اسلامی مملکت نہ بنا سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آج پھر تجدیدِ عہد کریں کہ ہم اس ملک کو حقیقی معنوں میں ایک ایسا مُلک بنائیں گے جو قائدِ اعظم کے خوابوں کی تعبیر ہو گا۔ سید تابش الوری کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی سید شہاب دہلوی نے قائدِ اعظم کے حضور منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا اور پھر پروفیسر منوّر علی خان نے اپنا پُرمغز اور مدلل مقالہ پیش کیا۔ مقالے کا عنوان تھا "قائدِ اعظم کا نصب العین"۔ انہوں نے اپنے مقالے میں بڑی وضاحت سے بتایا کہ قائدِ اعظم کا نصب العین کیا تھا۔ ان کے مطابق قائدِ اعظم قرآنی فکر اور احکام کو زندگی کا بنیادی سرچشمہ گردانتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ہمارے پاس قرآنِ حکیم کی شکل میں ایک مکمل ضابطۂ حیات موجود ہے، اس لیے ہمیں متفکر اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

قائدِ اعظم کا نصب العین

پروفیسر منوّر علی خان نے بتایا کہ اس مُلک کی ترقی، خوشحالی اور استحکام کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم مسلمان بن جائیں اور ملک میں نظامِ مصطفےٰؐ کا مکمل نفاذ کریں۔ قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم ان کے نصب العین کے حصول کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں۔ پروفیسر منوّر علی خان کی تقریر کے بعد نمازِ عصر کا وقفہ ہوا اور پندرہ منٹ کے بعد جب کارروائی دوبارہ شروع ہوئی، تو سپاسِ پاکستان کے صدر میاں مختار احمد فارانی کو دعوتِ اظہار دی گئی۔

جناب فارانی نے اپنی تقریر میں قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم وہ کردار پیدا کریں جس کا عملی نمونہ

بانیٔ پاکستان نے پیش کیا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اب تک قومی تشخص نہیں بنا سکے۔ پاکستان دو لخت ہوا اب اس بچے کھچے پاکستان کی حفاظت اور ترقی کے لیے ہمیں انہی اصولوں کو اپنانا ہوگا جن کی نشاندہی بانیٔ پاکستان نے کر دی تھی۔ اب بھی اگر ہم انہی اصولوں کو اپنا لیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں پھر وہی جذبہ نہ پیدا ہو جو تحریکِ پاکستان کے وقت نظر آتا تھا۔

اب مسٹر الطاف حسن قریشی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ سٹیج سیکرٹری نے کہا: "جس طرح تحریکِ آزادی میں علی برادران کی خدمات کو کوئی شخص فراموش نہیں کر سکتا، اسی طرح تحریکِ آزادیٔ صحافت میں قریشی برادران کی خدمات بھی تاریخ کا زریں باب ہیں"۔

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ کی بہترین پیشکش

یادِ شاھد

"مراۃ العروس" اور "توبۃ النصوح" کے عظیم مُصنف ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور ماہنامہ ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے یہ ادب کے اس شاندار دور کی رُوئیداد ہے جس میں اُردو کے اَن گنت مصنّفوں، شاعروں ــ اور نقادوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی اور بامِ عروج پر پہنچے۔

کتاب کی افادیت، دلچسپی اور عظمت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں صفِ اول کے ۳۲۔ ادیبوں کے مقالات شامل ہیں۔

جن میں

مُلّا واحدی ○ پروفیسر رشید احمد صدیقی

جوش ملیح آبادی ○ مولانا نعیم صدیقی

مولانا ماہر القادری ○ حضرت احسان دانش

اور محمد طفیل ایڈیٹر نقوش شامل ہیں۔

بڑی تقطیع۔ ۴۵۲ صفحات۔ مُجلّد۔ گرد پوش سے آراستہ

قیمت -/۲۰ رُوپے

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ ـ سمن آباد ـ لاہور

مسٹر الطاف حسن قریشی نے اپنی پُر مغز تقریر میں بڑی وضاحت سے ان عوامل کا ذکر کیا جن کی وجہ سے ہم قائدِ اعظم کے نظریات سے دور ہٹتے گئے اور ہمارے ملک میں مختلف اوقات میں مختلف قسم کے فتنے اُبھرتے رہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جن تعصبات کے خلاف قائدِ اعظم نے جہاد کیا تھا، اب وہ پھر سر اُٹھا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم کے بارے میں ملک میں پانچ طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہے جو زبان سے تو قائدِ اعظم کی تعریف و توصیف کرتا ہے، لیکن اپنے عمل میں مخلص نہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس مُلک میں قائدِ اعظم کے نظریے کے مطابق اسلام کی حکمرانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک قائدِ اعظم کی شخصیت اور اُن کے کردار و عمل کے بارے میں کوئی مستند کتاب موجود نہیں۔ دُوسرا طبقہ ایسا ہے جو غیر مُلکی نظریات پر یقین رکھتا ہے اور پھر مختلف انداز میں انہی نظریات کی روشنی میں قائدِ اعظم کے نظریات کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ لوگ کبھی لسانی اور کبھی صوبائی تعصب کی آڑ میں قوم میں اختلاف و افتراق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے نظریات کا زہر نوجوان نسل میں داخل کر رہے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو اب تک تقسیمِ ہند کو دل سے قبول نہیں کر سکا اور اس تقسیم کو غیر فطری ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ بظاہر اُن کی باتیں بڑی خوش کن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ کبھی محبت اور انسانیت کے نام پر کبھی لبرل ازم کے نام پر اور کبھی ثقافت و تہذیب کے نام پر مسلسل اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قائدِ اعظم کے دو قومی نظریئے کی نفی کی جائے اور تقسیم کو غیر فطری ثابت کیا جائے۔ چوتھا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو کمونزم پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ مساوات اور اخوت کے نام پر مُلک میں اسلام کے نظام کی بالواسطہ مخالفت کرتے ہیں۔ پانچواں طبقہ ایسا ہے جو گذشتہ تیس سال سے قائدِ اعظم کے نظریات و افکار کی حفاظت کے لیے اور پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی مملکت بنانے کے لیے مسلسل جدّوجہد کر رہا ہے۔ یہی لوگ ملک کے سچّے بہی خواہ ہیں، انہی کی کوششوں سے ملک میں نظامِ مصطفٰےؐ کی تحریک چلی اور ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ملک میں نظامِ مصطفٰےؐ کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کا آغاز ہو چکا ہے۔

مسٹر الطاف حسن قریشی کا کہنا تھا کہ اب ملک میں صحیح سمت کی طرف قدم بڑھا ہے، تو ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان نسل کو قائدِ اعظم کی شخصیت سے متعارف کرانے کے لیے اقدامات کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سرکاری طور پر قائدِ اعظم کی صرف ایک ہی مستند سوانح حیات شائع ہوئی ہے جو ایک انگریز مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں قائدِ اعظم کی شخصیت کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی، بلکہ بعض مقامات پر تو اُن کا امیج خراب ہوا ہے۔ اسی طرح عرب ممالک میں قائدِ اعظم کی شخصیت کو متعارف کرانے کے لیے کوئی کتاب عربی زبان میں موجود نہیں۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس مُلک کو عظیم اسلامی مُلک کے رُوپ میں دُنیا کے سامنے پیش کریں۔

انہوں نے کہا کہ بعض لوگ اب بھی لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مذموم کوششوں میں مصروف ہیں، لیکن ہمارا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی نہ صرف حوصلہ شکنی کریں، بلکہ اس قسم کا رویہ اختیار کیا جائے کہ ایک نیک معاشرہ تشکیل پا سکے۔ انہوں نے کہا ہمارا فرض ہے کہ ایسے سیاست دانوں کا سوشل بائیکاٹ کریں جو ملک میں محض اپنی قیادت کے لیے اختلاف و انتشار پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

جناب الطاف حسن قریشی نے ــــــــ بزمِ شاہین کو مبارک باد پیش کی کہ انہوں نے قائدِ اعظم کی یاد میں اس یادگار اور باوقار تقریب کا اہتمام کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کی انجمنوں کا فرض ہے کہ وہ عوام میں شعور پیدا کرنے کے لئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہوں نے نوجوان مُقرّرین کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان لوگوں کی تقاریر سے جس جذبے کا اظہار ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاولپور کے نوجوانوں میں قائدِ اعظم سے محبت کے بے پایاں جذبات موجود ہیں۔

آخر میں صدرِ مجلس مسٹر اسد محمود علوی نے اپنی تقریر میں اس بات پر تاسّف کا اظہار کیا کہ قائدِ اعظم کی شخصیت پر کتابوں کی کمی ہے۔ انہوں نے کہا جب میں سنٹرل لائبریری بہاولپور گیا تو مجھے اس بات پر افسوس ہوا کہ ان کے لئے ایک الماری بھی مختص نہیں، حالانکہ ان کی قد آور شخصیت کا تقاضا تھا کہ لائبریری کا ایک ونگ قائدِ اعظم پر کتابوں کے لئے مخصوص کر دیا جاتا۔ مسٹر علوی نے سپاسِ پاکستان اور بزمِ شاہین کا شکریہ ادا کیا کہ ان کو اس محفل میں بلایا گیا۔ انہوں نے کہا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پاکستان کو قائدِ اعظم کے خوابوں کی تعبیر بنانے کے لئے انتھک محنت کریں۔ صدارتی تقریر کے بعد اس محفل کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ اس تقریب میں شہر کی معروف شخصیات شریک ہوئیں۔ سابق قائدِ حزبِ اختلاف علامہ ارشد، خطیبِ شہر قاضی عظیم الدین اور اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالقیوم قریشی قابلِ ذکر ہیں۔

یہ شاید مسلم لیگ کی تقسیم کا نتیجہ ہے کہ اس بار بہاولپور میں مسلم لیگ نے بانیٔ پاکستان کی یاد منانے کا اہتمام کیا اور دونوں گروپوں نے الگ الگ جلسے منعقد کئے۔ مسلم لیگ پیر پگارا گروپ کے زیرِ اہتمام مہاجر کالونی میں ایک اجلاس ہوا جس کی صدارت مسلم لیگ کے ضلعی صدر مسٹر نور محمد شکانی نے کی۔ دوسرے مقررین کے علاوہ مسلم لیگ کے زونل سیکرٹری جنرل سید تابش الوری نے بھی خطاب کیا۔ چٹھہ گروپ کی طرف سے اجلاس کا اہتمام محلہ اسلام پورہ میں کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت مسلم لیگ کے زونل صدر چٹھہ گروپ میاں نظام الدین حیدر نے کی۔ اس میں مسلم لیگ چٹھہ گروپ کے سیکرٹری جنرل ملک محمد قاسم بھی شریک ہوئے۔ اگر دونوں اجلاسوں کو فوری مقبولیت کا معیار قرار دیا جائے، تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پیر پگارا گروپ کی طرف سے جس اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا، اس میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی، جب کہ چٹھہ گروپ کے اجلاس میں گنتی کے سامعین تھے، حالانکہ اس میں مسلم لیگ کے مرکزی رہنما ملک قاسم بھی شریک تھے۔

●●

پیپلز پارٹی کے عناصر بلیک اور قلت کے ذمہ دار ہیں

سیمنٹ کی تقسیم پرچون فروشوں کے حوالے کی جائے

یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی کا مطالبہ!

سیمنٹ کا بحران، قلت، گرانی، چور بازاری نے جہاں نجی اور سرکاری شعبے کے تعمیراتی کام کو متاثر کیا، وہیں اس کی تجارت میں مصروف لاکھوں چھوٹے چھوٹے دکانداروں کو مالی دشواریوں سے دو چار کیا۔

سیمنٹ کی گرانی اور قلت سے پہلے عام صارف اپنی قریبی دکان سے ضرورت پوری کیا کرتا تھا، لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں مستحق صارفین اور پیشہ ور اصحاب اصلاحی کمیٹیوں کے ارکان کے گھروں کے طواف کرتے نظر آتے ہیں اور جہاں ارکان دیندار نیک ہیں، وہاں مستحق صارف پرمٹ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن عموماً یہ پرمٹ پیشہ ور "ضرورت مندوں" کو ملتے ہیں جو سیمنٹ کی قیمتوں میں اپنا منافع شامل کر کے حقیقی صارف کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کے سبب گوجرانوالہ میں عموماً بلیک مارکیٹ نرخ ۶۰/- تا ۷۰ روپے ہے۔

کئی ہفتوں سے ملک بھر میں پرچون فروش حکومت سے مطالبات کر رہے تھے اور اب جماعتی حیثیت سے یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی (رجسٹرڈ) کو پنجاب بھر کے تمام اضلاع کی نمائندگی کا دعوےٰ ہے۔

اس سوسائٹی نے ۱۹ دسمبر کو گوجرانوالہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کیا جس میں تمام اضلاع کی سیمنٹ پرچون فروشوں کی انجمنوں کے سینکڑوں مندوبین نے شرکت کی۔ اس اجتماع کی صدارت مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن اور امیر جماعت اسلامی چودھری محمد اسلم نے فرمائی اور اب ۲۹ دسمبر کو پنجاب بھر کے سیمنٹ پرچون فروشوں کا ایک کنونشن جناح ہال گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مرکزی وزیر صحت جناب صبح صادق کھوسو نے فرمائی۔ ان دونوں اجتماعات کی تفصیلات قومی اخبارات کی زینت بن چکی ہیں۔

"زندگی" نے یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی (رجسٹرڈ) پنجاب کے جنرل سیکرٹری جناب محمد ارشد مغل، ڈپٹی سیکرٹری جناب محمد جمیل، اور جناب غلام سرور (خزانچی)، سے انٹرویو کیا۔

ان اصحاب نے سیمنٹ کی بلیک پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ جن کے پاس سیمنٹ کی ایجنسیاں ہیں، ان کا اس کاروبار سے صرف منافع کا تعلق ہے۔ یہ اصحاب دوسرا کاروبار کر رہے ہیں۔ یہ صرف بنک میں رقم جمع کرا کر اور حکومت سے پرمٹ حاصل کر کے فیکٹری گیٹ پر ہی بلیک میں فروخت کر دیتے ہیں۔ حکومت دس ٹن کا ٹرک ۶۲۰۰ روپے کا دیتی ہے، لیکن یہ پرمٹ ہولڈر فیکٹری گیٹ پر ہی دس ہزار روپے میں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ٹرک سے چار ہزار روپے کماتے ہیں۔ اگر حکومت ہر شہر کے پرچون فروشوں کو اجتماعی طور پر پرمٹ دے، تو اس طرح نہ صرف بلیک کا رجحان ختم ہو گا، بلکہ عام صارف تک درست قیمت پر سیمنٹ پہنچے گا۔

ان اصحاب نے بتایا کہ قومی تحویل میں سیمنٹ کے کارخانے جانے سے قبل ہر کارخانے دار نے اپنے ڈیلرز اور ایجنٹ رکھے ہوئے تھے اور وہ پرچون فروشوں کو بلا کر مال دیتے تھے۔ مقابلہ و مسابقت کا رجحان تھا، لیکن بھٹو حکومت نے قومی ملکیت قرار دے کر اور اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن قائم کر کے اس کاروبار میں رشوت، بدعنوانی اور منافع خور عناصر کو شامل کر دیا ہے۔

سیکرٹری جنرل محمد ارشد مغل نے کہا کہ سیمنٹ کی پیداوار میں کمی بھی بلیک کا ایک سبب ہے اور اس کو ملک کے تمام پرچون فروشوں کے تعاون سے حکومت بآسانی ختم کر سکتی ہے۔ انہوں نے مثال دے کر بتایا کہ گوجرانوالہ کی آبادی ۳۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے، جبکہ اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن کے ۵۲ ایجنٹ تھے جن میں ۲۸ ایجنٹ حکومت ختم کر چکی ہے۔ یہ حکومت پورے شہر و ضلع کے صارفین کو کس طرح سیمنٹ پہنچا سکتے ہیں؟ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ایجنسی سسٹم ختم کر دیا جائے اور ہر ضلع و شہر کے پرچون فروشوں کی انجمنوں کا اعتماد حاصل کیا جائے۔

غلام سرور نے بتایا کہ سابق بدعنوان حکمرانوں نے جب سیمنٹ کو گراں کیا اور اپنی پارٹی کارکنوں کو اس کاروبار میں داخل کیا تو پرچون فروشوں نے انجمن تشکیل کی، لیکن پیپلز پارٹی کے مفاد پرست عناصر نے اسے پی پی کی ذیلی تنظیم بنا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ صوبائی انجمن دکان داران سیمنٹ پرچون فروشاں رجسٹرڈ کے صدر ملک اللہ دتہ اور اس کے حواریوں نے بھٹو کو باپ بنا کر ملک بھر میں چلنے والی تحریک نظام مصطفیٰ

وفاقی وزیر صبح صادق کھوسو اور مقامی نمائندے خطاب کر رہے ہیں

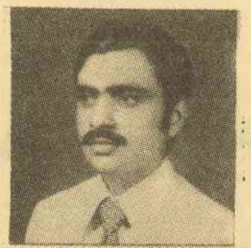

جناب محمد ارشد مغل، جنرل سیکرٹری

جناب محمد جمیل، ڈپٹی سیکرٹری

جناب غلام سرور، خزانچی

کے خلاف غنڈہ گردی کی، اس لیے ہم لوگ کنارہ کش ہو گئے اور یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی (رجسٹرڈ) پنجاب کے نام پر اپنا پلیٹ فارم بنایا جس کی بنیاد خالص اقتصادی تھی۔

جناب محمد جمیل نے کہا کہ پیپلز پارٹی کی اس غنڈہ گردی کے خلاف ہم نے عدالتِ عالیہ میں رٹ پٹیشن بھی دائر کی اور ہائی کورٹ نے اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن کو ہدایت بھی کی، لیکن حکمران جماعت نے اپنا اثر استعمال کیا اور ملک اللہ دتہ کی انجمن کو مخصوص کوٹہ ملتا رہا، جبکہ ملک بھر کے سیمنٹ پرچون فروش جو پیپلز پارٹی سے نفرت کرتے تھے، مالی بحران کا شکار بن گئے۔

سیکرٹری جنرل محمد ارشد مغل نے کہا کہ ہمارا مطالبہ ہے کہ قومی اتحاد کی حکومت بالخصوص پروفیسر غفور احمد ملک بھر کے سیمنٹ پرچون فروشوں کو بلاتخصیص سیمنٹ کا کوٹہ فراہم کرائیں۔

انجمن دکانداران سیمنٹ پرچون فروشان رجسٹرڈ کے بدعنوان سیکرٹری مالیات چودھری محمد خان، ان کے ساتھی حاجی عبداللہ، میاں عبدالعزیز ٹھیکیدار، محمد صادق، میاں محمد صادق، مولوی رشید، حاجی عبدالحق پر جعل سازی کے ذریعے ۹۶ ٹرک سیمنٹ کا کوٹہ حاصل کر کے بلیک میں فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار ہو چکے ہیں اور مارشل لاء حکام تحقیقات کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی اس ذیلی تنظیم نے جگہ جگہ سیمنٹ کی بلیک کرنے کا منظم طریقہ اختیار کیا اور وہی آج نئے انداز سے میدان میں آگئی ہے اور یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے ان رہنماؤں نے قومی اتحاد سے کہا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ سیمنٹ پرچون فروشوں کی واضح اکثریت ان کی حامی ہے اور اس کا فرض ہے کہ جعلسازی اور بلیک کرنے والے ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کی اس ذیلی تنظیم کے عناصر سے بھی سیمنٹ کی تجارت کو بچائے۔

مورخہ ۷ ردسمبر ۷۸ء بروز اتوار جماعت اسلامی سرائے عالمگیر ضلع گجرات کا ہفتہ وار اجتماع ہوا اور مندرجہ ذیل قراردادیں اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔

پہلی قرارداد میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے دو دسمبر کے اعلان کا جس میں اسلامی نظام کی ابتدا کی گئی ہے، خیر مقدم کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ہم اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ہر قسم کی قربانی کا یقین دلاتے ہیں۔

تیسری قرارداد میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ سرائے عالمگیر کے لئے آٹے کا سکیل جو پہلے ہی کم تھا، اب پندرہ سو گرام فی کس کے بجائے گیارہ سو گرام فی کس کر دیا گیا ہے۔ جس سے غریب لوگوں کو بہت پریشانی کا سامنا ہے، کیونکہ سرائے عالمگیر زرعی پیداوار کے لحاظ سے کمی کا علاقہ ہے اس لئے متعلقہ افسران سے گزارش ہے کہ آٹے کا پہلا سکیل بحال کیا جائے اور آٹے کا کوٹہ صرف سرائے عالمگیر یونین تک ہی نہ رکھا جائے، بلکہ اس کا دائرہ پورے تھانے کے دیہات تک بڑھا دیا جائے، کیونکہ اس سارے علاقے کے غریب لوگ سستا آٹا نہ ملنے پر سخت مشکلات میں ہیں، اگر دیہات کے بارے میں رپورٹ مطلوب ہو، تو انتظامیہ اپنے ذرائع سے تحقیقات کر سکتی ہے کہ غریب عوام کو کن پریشانیوں کا سامنا ہے۔

چوتھی قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اسلامی نظام کی کامیابی کے لئے تمام ذرائع اور وسائل بیک وقت استعمال کئے جائیں، تاکہ اسلامی نظام اپنی ساری برکات کے ساتھ ایک موثر اور غالب نظام کی حیثیت حاصل کرے اس کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کا استعمال ضروری ہے۔

پانچویں قرارداد میں تمام دینی اور سیاسی جماعتوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر صرف اسلام اور ملک کے مفاد کو ترجیح دیں۔ مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹنے کے بجائے امتِ واحدہ کی حیثیت اختیار کرنے پر توجہ دیں اور صرف ایک قومی پلیٹ فارم (قومی اتحاد) کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔

(ناظم نشر و اشاعت، جماعت اسلامی سرائے عالمگیر)

اسٹلمینز بلیچ کریم سے
جلد کو شگفتہ اور دلکش بنایئے

خوبصورتی کا انحصار جلد کی شگفتگی اور تازگی پر ہے، بھیکی رنگت کو دور کرنے، دھوپ کی تمازت موسم کا ردوبدل اور کاسمیٹک کے اثرات سے جلد کو محفوظ رکھنے کے لئے اسٹلمینز بلیچ کریم استعمال کیجئے۔

امریکہ میں ۱۸۹۱ء میں قائم شدہ دنیا کی قدیم ترین اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کریم۔

اسٹلمینز

جلد کی حفاظت کے لئے آرائش حسن کے ماہرین کا تجویز کردہ

BOND

ٹینڈر نوٹس

مندرجہ ذیل کاموں کے لیے شرح فیصد بحساب ایٹم ریٹ محکمہ انہار گورنمنٹ پنجاب کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے نئے شیڈول ریٹ ۱۹۷۸/۱۲/۱ کے مطابق سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں، جو کہ مورخہ ۱۹۷۹/۱/۱۷ بوقت ۱۲ بجے قبل دوپہر ٹینڈر دہندگان یا ان کے اختیار شدہ ایجنٹوں کی کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

(۱) ٹینڈر کے ساتھ ایگزیکٹو انجینئر سینٹرل سٹورز ڈویژن۔ کینال بنک مغلپورہ لاہور کے نام ڈیپازٹ ایٹ کال پر داخل کروانا ضروری ہوگا۔ ورنہ ٹینڈر وصول نہیں کیا جائے گا۔ مشروط ٹینڈر ناقابلِ قبول ہوگا۔

(۲) ~~~

(۳) ٹینڈر فارم -/۵ روپے کے عوض بتاریخ ۱۹۷۹/۱/۱۶ کو فروخت ہوں گے۔

(۴) دوسری ڈویژنوں سے خریدا ہوا ٹینڈر کارآمد تصور نہیں ہوگا۔

(۵) بغیر وجہ بتائے افسرِ مجاز ٹینڈر کو مسترد کر سکتا ہے۔

(۶) بل سے تین فیصدی انکم ٹیکس وضع کر لیا جائے گا۔

(۷) دفتری اوقات میں کام کی شرائط و دیگر معلومات دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۸) کام میں استعمال ہونے والی اشیاء کی تعداد و معاہدہ کی رقم زیر دستخطی یعنی ایگزیکٹو انجینئر صاحب کم یا بڑھا سکتے ہیں۔ نیز کسی تنازعہ کی صورت میں ایس۔ ای۔ میکینیکل سرکل کا فیصلہ آخری اور حتمی تصور ہوگا۔

ٹینڈر نمبر	نمبر شمار	نام کام	تخمیناً لاگت	زرِ بیعانہ	مدت کام
I :-	۱ -	ڈائریکٹر لینڈ ریکلمشن کینال بنک مغلپورہ لاہور کے کچے/پکے حصے کی پہلی منزل کی تعمیر۔	-/۲،۱۷،۵۳۶		۳۰/۴/۷۹
	۲ -	واٹر سپلائی فٹنگ۔	-/۱۵،۷۳۵	-/۴،۷۲۰	
	۳ -	سوئی گیس فٹنگ۔	-/۲،۷۴۵		
II :-	۱ -	نئی عمارت کی پہلی منزل میں بجلی لگانا۔	-/۲۹،۴۶۲	-/۵۹۰	″
III :-	۱ -	اعدد تعمیر سیپٹک ٹینک۔	-/۵،۷۷۰	-/۷۰،۶۰۰	″
	۲ -	۶ عدد تعمیر مین ہول۔	-/۵،۰۰۹		
	۳ -	جذب کرنے والا گڑھا۔	-/۲،۵۷۰		
	۴ -	بیت الخلاء تعمیر کرنا۔	-/۷،۷۴۳		
	۵ -	بیت الخلاء کے کمرے کا فرش لگانا۔	-/۴،۳۹۴		
	۶ -	واٹر سپلائی فٹنگ۔	-/۷،۱۳۵		
	۷ -	سوئی گیس فٹنگ	-/۲،۶۸۵		
		میزان	-/۳،۰۰،۷۸۴		

ایگزیکٹو انجینئر سینٹرل سٹورز ڈویژن۔ کینال بنک۔ مغلپورہ۔ لاہور

IPL - 57

رفیق ڈوگر

سی آئی اے کی خدمات انجام دینے والے پاکستانی صحافی

اگر ہم کہیں کہ ہم نہیں مانتے، تو آپ سب ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ ہم کہتے ہیں ہم نہیں مانتے۔ پاکستان کے اخبارات نے امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ پاکستانی صحافیوں کی جو فہرست شائع کی ہے، ہم اسے نہیں مانتے کہ وہ خود اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فہرست سب سے پہلے بھارت کے ایک انگریزی ماہنامہ "سوریا" نے شائع کی تھی۔ بھارت کی سابقہ پاکستان دشمن وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کی بہو مانیکا گاندھی اس رسالے کی بذاتِ خود ایڈیٹر ہیں۔ بھارتی اخبارات ان دنوں اندرا گاندھی کے کافی زیادہ خلاف ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، انہوں نے ان اخبارات اور اخبار نویسوں کو آئینہ دکھانے کے لئے یہ فہرست شائع کر دی ہو، اس لئے یہ پاکستان کے بارے میں کیسے ہوئی؟ پاکستان اور بھارت میں مانیکا گاندھی اور اس کا رسالہ اس حوالے سے سب سے زیادہ با اثر اور باخبر کہا جا سکتا ہے کہ یہ گاندھی خاندان کا رسالہ ہے۔ اندرا گاندھی بھارت کی وزیرِ اعظم رہی ہیں اور بھارت کے بانی وزیرِ اعظم کی صاحبزادی ہیں۔ اس طرح امریکہ، وہاں کے پریس، سیاستدانوں اور حکمرانوں تک سے ان کے ذاتی اور گہرے سیاسی تعلقات ہیں۔ ان کی رسائی کافی اندر تک ہے۔ اسی لئے وہ اندر کی فہرست ڈھونڈ لائی ہیں یا ڈھونڈ لائے ہیں اور اپنی لڑائی لڑتے لڑتے خواہ مخواہ ہمیں اور ہمارے مقدس معزز اور نیک نام اخبار نویسوں کو بھی بدنام کرنے لگے ہیں۔

بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان میں امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ صحافیوں کی جو فہرست شائع کی گئی ہے، اس میں بھارت کے آٹھ، پاکستان کے دس، بنگلہ دیش کے پانچ اور افغانستان کے تین صحافی شامل ہیں. گویا سی آئی اے میں پاکستان کی نمائندگی سب سے زیادہ ہے اور بھارت کی آبادی پاکستان سے کئی گنا زیادہ تھے اور اس کے صرف آٹھ اخبار نویس معززین کی اس فہرست میں شامل ہیں اور پاکستان کے دس۔ بنگلہ دیش کی آبادی بھی ہم سے زیادہ ہے، لیکن سی آئی اے میں اس کی نمائندگی ہم سے آدھی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سی آئی اے کی نظروں میں ہماری کتنی اہمیت اور قدر ہے اور اس کے ساتھ ہمارے کتنے گہرے تعلقات ہیں۔ اگر یہ فہرست درست ہے، تو بھارت کے وزیرِ خارجہ جناب اٹل بہاری باجپائی کو فوری طور پر سی آئی اے کے اس جانبدارانہ رویئے پر امریکہ سے احتجاج کرنا چاہیئے، بلکہ بھارت، بنگلہ دیش اور افغانستان سے مل کر نمائندگی کے اس مسئلے پر ایک مشترکہ کانفرنس بلانی چاہیئے اور مشترکہ احتجاج کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف حکومتِ پاکستان کو سی آئی اے کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے سی آئی اے اور امریکہ والے جواب دیں کہ پاکستان میں بھارت اور دیگر ممالک کی نسبت صحافت اور صحافیوں کا پیشہ وارانہ معیار زیادہ بلند ہے اور انہوں نے اپنے ایجنٹوں کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر کیا ہے۔ پاکستان میں زیادہ لوگ اہل ملے اور زیادہ رکھ لئے گئے. بھارت، بنگلہ دیش اور افغانستان کو اپنے ہاں صحافت اور صحافیوں کی اہلیت بڑھانے پر دھیان دینا چاہیئے۔ اس صورت میں جناب باجپائی کو اپنے سرپرستِ اعلیٰ روس کی مدد سے اپنے اور اپنے دوست ممالک کے اخبار نویسوں کی تربیت کے لئے خصوصی اقدامات کرنا چاہییں۔

پاکستان میں سی آئی اے کے ایجنٹ صحافیوں میں جو معززین شامل ہیں، ان کے نام نامی ہیں (۱) عبدالحمید چھاپرا (۲) محمود شام (۳) ارشاد راؤ (۴) ایچ کے برکی (۵) سلامت علی (۶) شمیم احمد (۷) نسیم ہمایوں (۸) شمیم الرحمان (۹) عبدالقادر (۱۰) مرغوب صدیقی۔

یہ نام اتنے بھاری اور جانے پہچانے ہیں کہ پاکستان کے اندر باہر سب لوگ انہیں جانتے ہیں. خاص طور پر جناب ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے کہ یہ سب ایک آدھ کے سوا اس کے دست و بازو ہوتے تھے اور اب تک اس کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اگر یہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہوتے، تو بھٹو انہیں کیوں ساتھ رکھتے؟ اس کے ہر دورے میں اس کے ساتھ جاتے تھے۔ اس کی ہر پالیسی اور اقدام سے انقلاب نکال نکال کر عوام کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے جانے کے بعد ملک میں صحافت کی آزادی کے لئے بھی پریشان رہا کرتے تھے اور جناب برنا کے ساتھ مل کر جیل بھی بار بار جایا کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں انقلابی اور ترقی پسند ہیں اور ترقی پسند قوتوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ سی آئی اے کے نمائندے نہیں ہو سکتے کہ اس کے لئے سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہونا ضروری ہے مثلاً سی۔ آئی۔ اے کے ایجنٹ نمبر ایک —— جناب عبدالحمید چھاپرا روزنامہ "جنگ" کراچی، راولپنڈی اور کوئٹہ کے سب سے نامور رپورٹر ہیں۔ کراچی میں برنا کے دستِ راست۔ ان کی یونین کے صدر۔ ان کے ساتھ ہر بار جیل جاتے ہیں۔ بڑے دل گردے کے آدمی ہیں۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں کراچی کی ایک صوبائی سیٹ کے لئے تحریکِ استقلال کے بہت بڑے اُمیدوار تھے اور صحافت کی آزادی کی حالیہ تحریک میں بڑے دم خم سے جیل جایا کرتے تھے۔ سی آئی۔ اے کے نمبر دو ایجنٹ جناب محمود شام کے معیارِ صحافت کا اندازہ ان کے انقلاب آور پرچے ہفت روزہ "معیار" سے کیا جا سکتا ہے انہوں نے بھٹو کے ساتھ نظریاتی اور سیاسی سفر لاڑکانہ سے پیکنگ تک کیا اور پھر اس کا حال بھی تحریر فرمایا، وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور ملک کے سب سے بڑے ترقی پسند صحافی ہوتے ہیں، اس لئے وہ سی آئی اے کے ایجنٹ کیسے ہو سکتے ہیں۔

جناب ارشاد راؤ کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ اصلی اور خالص انقلابی پرچہ "الفتح" کے مالک و مختار جنہوں نے ملک میں انقلاب کی خاطر پریس ٹرسٹ کے اخبار کی نوکری داؤ پر لگا دی تھی اور بھٹو نے اقتدار میں آنے کے بعد انہیں با معاوضہ بحال کیا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے انقلابی "خدا کی بستی" والے شوکت صدیقی تک ان کے بے دام غلام ہیں۔ چوتھے نمبر پر جناب ایچ کے برکی ہیں اور ملک کا بچہ بچہ یا کم از کم پیپلز پارٹی کا بچہ بچہ ان کی خدماتِ بھٹو سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ سلامت علی بھی ان کے ہم ادارہ اور ہم پیشہ ہوتے ہیں اور پھر مرغوب صدیقی۔ وائٹ پیپر بھی ان کے ذکرِ خیر سے بھرا پڑا ہے، وہ جناب بھٹو کو معلومات اور رپورٹیں فراہم کرنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہوتے تھے اس لئے انہیں سی آئی اے کی ایجنٹی کی کیا ضرورت تھی؟

اس فہرست کو پورا پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سی آئی اے نے پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کے انتخاب میں بائیں بازو کو زیادہ نمائندگی دی ہے، اس کے تمام بڑے بڑے اہلِ قلم اس کی فہرست پہ ہیں، جب کہ دائیں بازو کو مناسب نمائندگی نہیں دی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ بھرتی اس وقت کی حکومت کے تعاون سے کی ہو اور جناب بھٹو نے اپنے آدمی سی آئی اے میں داخل کر دیئے ہوں کہ ان میں اکثریت ان کے اپنے آدمیوں کی ہے اور ایک آدھ فی الفکو محض دکھاوے کے طور پر شامل کر دیا گیا ہو۔ موجودہ حکومت کو اس پہلو کا بھی جائزہ لینا چاہیئے اور اگر یہ فہرست درست ہے، تو ان اخبار نویسوں کے لئے خصوصی تمغوں کا اعلان کرنا چاہیئے جنہوں نے پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن، بلکہ روشن ترین کر دیا ہے۔ سابقہ حکومت نے انہیں نوازنے کا جو ریکارڈ قائم کیا تھا آخر اس کی کوئی وجہ تو تھی۔ وہ ان کی اہمیت اور اہلیت سے آگاہ تھی۔ موجودہ حکومت کو بھی اس کا کھلے دل سے اقرار کر لینا چاہیئے اور ملک کے ان نامور سپوتوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے جنہوں نے سی آئی اے کے مقابلے کے امتحان میں بھارت جیسے دشمن ملک کے امیدواروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ملک اور قوم کے لئے سب سے زیادہ تمغے حاصل کئے ہیں۔ ●●

مُسلم لیگ کی بولی کراؤ

وکلاء مسلم لیگی لیڈروں کا گھیراؤ کریں گے (خبر)

آج ۲۵ دسمبر ہے۔

ہم اس شخص کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں جس نے خوابوں کو ایک جیتے جاگتے پیکر کا روپ دیا۔ اس نے ایک خواب کو جسم دے کر کروڑوں انسانوں کو نئے مہکتے خواب بھی دیے تھے اور خوابوں کی تعبیر بھی بتائی تھی، لیکن ہم خواب بیچتے اور اپنی جیتی جاگتی آنکھوں میں تاریکیاں بساتے رہے۔ ہر سال ۲۵ دسمبر کو قائداعظمؒ کے یوم ولادت پر لفظوں کا خراج پیش کرتے رہے، لفظ جو اپنے معانی سے بچھڑ گئے ہیں۔

آج ہم نے قائد کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھائیں، مہکتے گلاب لے کے گئے، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، لیکن قائد نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک نہیں کہ ہم نے ان کو سنگِ مرمر کے ریشمی خواب میں بند کر دیا ہے۔ اس کے باوجود عبرتوں کی کہانیاں چہروں پر سجاتے ہم قائدِاعظمؒ کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں گے۔

ہاں وہ لوگ بھی اپنے قائد کو نہیں بھولے جو ان کی جماعت کے وارث کہلاتے ہیں۔ اسی جماعت کے بارے میں حضرت قائد نے کہا تھا "میں اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک پاکستان دوسری مسلم لیگ" اس بار اسی جماعت کو دو لخت کرنے والوں نے پہلے کے مقابلے میں دوگنا جلسے کئے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے، ان کے پاس گلاب کے مہکتے پھول نہ تھے، الفاظ تھے جو اپنی حرمت لٹا چکے ہیں، وہ صرف لفظوں کی بارش میں اپنے چہرے چھپانے میں کوشاں نظر آئے۔

ایسا ہی ایک جلسہ لاہور میں ـــــ مسلم لیگ ہاؤس میں ہوا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا، در و دیوار اداس اداس تھے۔ پیڑ چپ سادھے وہ آوازیں سن رہے تھے جو دلوں میں طوفان برپا کئے بغیر فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ لفظوں کی بارش ہوتی رہی، لیکن اکتاہٹ زدہ چہروں پر شادابی کی کوئی کرن نہ پھوٹی۔

اس جلسے میں تقریر کرنے والے تو شاید بہت تھے، لیکن کہنے کو کسی کے پاس کچھ نہ تھا، باتیں، باتیں اور بے ربط باتیں ـــ اکیلے زاہد سرفراز کر بھی کیا سکتے تھے، وہ ایک زخمی صدا دینے والے کی طرح بے ربط رشتوں کو لفظوں کی ڈوری میں پرونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سرما کی روپہلی دھوپ میں ان کے سامنے پھیلے لان میں سو سوا سو سے زیادہ چہرے نظر نہ آتے اور ان پر بھی ایک اکتاہٹ زدہ بے تعلقی سی چھائی ہوئی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کی جماعت کے مرکزی دفتر کا یہ منظر ان پیڑوں اور دیواروں نے پہلے شاید کبھی نہ دیکھا ہو۔

میاں زاہد سرفراز تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ قائدِ اعظمؒ اس صدی کے عظیم ترین سیاستدان تھے، لیکن مسلم لیگ ہاؤس کی اداسی دیکھ کر لفظ شرمندہ ہو کر فضا میں گم ہو جاتے تھے کہ اتنے بڑے قائد کے اتنے بڑے کارنامے کے بعد انسانوں کا یہ سمندر ایک موتی بھی نہ اگل سکا۔ کوٹھیوں کے لان پھیلتے چلے گئے انسان سمٹتے رہے، لفظوں کے بیوپاری مفادات کے جنگل میں راستہ بھول گئے۔ اب وہ خود سے بچھڑ کر واپس کیسے لوٹیں گے۔

در و دیوار کی اس اداسی کے باوجود میاں زاہد سرفراز نے تقریر کی۔ ان کے چہرے پر بھی سوچوں نے جال بُن رکھا تھا اور تازگی اور شادابی نظر نہ آتی تھی۔ شاید اسی احساسِ جرم سے مغلوب ہو کر وہ کہہ رہے تھے "آئے کوئی اس طرف سے آئے مجھے پتھر مارے مجھے سنگسار کرے کہ ہم نے نوابزادوں، جاگیرداروں اور . . . . سے نجات حاصل کرنے کا گناہ کیا ہے"

میاں صاحب بہت دکھی تھے، جذباتی ہو گئے، اپنے دشمنوں کو "ڈوبتے جہاز کے چوہے" کہہ گزرے، حرامزادے کہا، چڑھتے سورج کے پجاری قرار دیا، لاشیں گردانا، لیکن مسلم لیگ ہاؤس کے در و دیوار پر اداسی نے پر پھیلائے رکھے۔

آج ۲۵ دسمبر ہے۔

قائدِ اعظمؒ کا ایک وارث دکھی دل کے ساتھ مسلم لیگ کے اپنے گھر میں ماتم کناں ہے، وہ اقتدار کے سورج کی پوجا کرنے والوں کا شاکی ہے یہ اور بات ہے کہ اسی اقتدار میں خود بھی شامل ہے جس نے ہر دور میں مسلم لیگ کو لخت لخت کیا۔

آج مسلم لیگ ہاؤس کے در و دیوار یہ بھی سن رہے ہیں: "اب ہم کینسر کے کسی سیاسی مریض کو اپنا تازہ خون نہیں دے سکتے، اب ہم ان کی لاشیں اپنے کندھوں پر نہیں اٹھا سکتے، اب صرف یہ کر سکتے ہیں کہ ان کی لاشوں کو دفن کر دیں جن کی سڑاند لوگوں کو لیگ سے دور کر دیتی ہے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا، تو مسلم لیگ کو ٹھیکے پر دے دو، اس کی بولی کراؤ جس کی بولی سب سے زیادہ ہو، اسی کو دے دو"

یہ بالاقامت جواں سال لیگی دکھی دل کے ساتھ کہہ رہے ہیں:

"ہمیں جذبوں کا اتحاد چاہیئے، سوچ کا دھارا ایک ہو، نصب العین ایک ہو تو اتحاد ہو گا اور وہ کسی کام بھی آئے گا، جسموں کا اتحاد کس کام کا؟ ہمیں ۱۸ سال اس کوشش میں لگ گئے کہ مسلم لیگ کو ڈرائنگ روم سے نکال کر میدانِ عمل میں لائیں۔ ہم اسے گیٹ تک لاتے ہیں کہ کوئی چور اسے واپس پھر ڈرائنگ روم میں لے جاتا ہے۔ ہم یہ تماشہ دیکھتے آئے ہیں کہ جب بھی لیگ میں دم خم پیدا ہوتا ہے، بڑے بڑے رستہ گیر بحران پیدا کر دیتے ہیں۔ جاگیرداروں کے بیٹے سیاسی چوہے ہیں، یہ لیگ کی لاش نوچتے ہیں۔

"اب ہمیں راستے تلاش کرنا پڑیں گے۔ رہنما کا کام یہ ہے کہ وہ قوم کو نصب العین دے، راستہ متعین کرے اور جو یہ نہیں کر سکتا قوم اس کی قیادت قبول نہ کرے گی۔ مسلم لیگ ڈرائنگ روم میں بند نہیں رکھی جا سکتی۔ ارد گرد حالات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ آنکھیں کھول کر منزل کی جانب بڑھنا ہو گا۔"

ہاں یہ صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں کچھ زیادہ دن نہیں گزرے یہی سب لوگ اسی گھر میں آباد تھے ہنستے بولتے لوگ، دمکتے چہرے، مہکتے لباس انہی دیواروں کو مہکاتے تھے، تب بھی خوش تھے، مگر اقتدار کے سائے نے منظر بدل دیے۔ اب لاشیں نظر آتی ہیں۔ یہ لاشیں انسانوں کی نہیں مسلم لیگ کی ہیں۔ اب قائدِ اعظمؒ کی اس جماعت کے کتبے لکھے جا رہے ہیں، سنہری لفظوں میں نوحے لکھے جا رہے ہیں، مگر لفظ سارے قصیدے کے ہیں۔

مسلم لیگ ہاؤس کے در و دیوار اداس ہیں، آج ۲۵ دسمبر ہے، آج بھی اس کے آنگن میں شادابی کی کرن نہیں پھوٹی۔

اسلامی ممالک مشترکہ تجارت کے لیے متحد ہو گئے

کراچی میں اسلامی ممالک کے ایوانِ صنعت و تجارت کی کانفرنس کی اندرونی رپورٹ

اکرام غازی

یہ آج سے ۲۹ سال پہلے کی بات ہے، جب کراچی کے خالق دینا ہال میں ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء کے دن "انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس" کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس میں سولہ برادر اسلامی ممالک نے شرکت کی جن سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علیخاں نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اسلامی ممالک کے تعلقات صرف تجارتی لین دین تک محدود رکھیں اور دیگر امور کو نظرانداز کر دیں۔ ہم اپنے مشترکہ مفاد کے لیے ہر طرح کی باہمی سرگرمی میں شرکت کے خواہش مند ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صنعت و تجارت کے ان نمائندوں نے یہ کانفرنس محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے طلب نہیں کی ہے۔ یہ کانفرنس اس لیے نہیں بلائی گئی ہے کہ اس میں ان کا کچھ اپنا فائدہ ہے۔ ان کی دلی خواہش ہے کہ دنیا کے عوام بہتر زندگی گزاریں اور خاص طور پر وہ جو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں، خوشحال بن سکیں۔

یہ پاکستان کے قیام کے ابتدائی دن تھے۔ دنیا کے بڑے حصہ پر نوآبادیاتی تسلط قائم تھا جو ممالک آزاد ہوتے تھے، وہ دوسری جنگِ عظیم کے معاشی تباہی کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ صنعت و حرفت پر مغرب کا غلبہ تھا۔ معاشی آزادی کا تصور نوآزاد ملکوں کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوا تھا، لیکن پاکستان نے اس ماحول میں بھی معاشی ترقی اور دنیا کے عوام کی خوشحالی کے لیے چراغ روشن کیا۔ بین الاقوامی سیاسی اتار چڑھاؤ اور ایک طویل آزمائش سے گزرنے کے بعد اسلامی دنیا آج پھر پلٹ کر پاکستان کے اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے جو قوم پرستی کے اندھے سیلاب میں دھندلا گیا تھا۔

دسمبر کے دن سردیوں کے علاوہ پاکستانیوں کو اس تلخ آزمائش کی بھی یاد دلا دیتے ہیں، جس میں تنگ نظری کے جنون نے ان سے ان کے بھائی جدا کر دیے تھے، لیکن اب یہ جنون ختم ہو گیا ہے اور قوم پرستی کے قفس کے جل جانے کے بعد اب ایک نیا قفس جنم لے رہا ہے، جس کے بول محبت بھرے اور نظر پیار بھری ہے۔ اسی وجہ سے دسمبر کی ہلکی پھلکی سردیوں میں بنگلہ دیش کا دس رکنی وفد پورے جوش و خروش سے اسلامی ایوان تجارت و صنعت کی دوسری کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی میں بتیس برادر اسلامی ممالک کے درمیان موجود تھا۔ تیس سال میں اسلامی برادری کے معاشی اتحاد کے خواہش مندوں کی تعداد سولہ سے بتیس ہو گئی ہے اب یہ ممالک ایک عددی طاقت ہی نہیں، بلکہ ان میں دنیا کی نصف معاشی قوت کنٹرول کرنے والے ممالک بھی موجود ہیں جن کی ایک معمولی سی جنبش سے یورپی معیشت بحران کا شکار ہو جاتی ہے، اس لیے اسلامی ممالک کا یہ اجتماع بڑا تاریخی اور اہم تھا۔

۱۶ دسمبر کو اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے وہ تمام باتیں کہہ دیں جو انہیں کہنا چاہیے تھیں۔ انہوں نے عالم اسلام کے اتحاد کا ذکر کیا۔ تجارت کے لیے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع کردہ اصولوں پر کاربند ہونے کو کہا اور دعا کی کہ یہ مسلمانوں کا اجتماع کامیاب ہو اور مسلمانوں کے اتحاد اور خوشحالی کا ضامن بنے۔ بنگلہ دیش کا وفد ۱۶ دسمبر کی اس خنک صبح جنرل ضیاء الحق کی اس پرجوش اسلامی تقریر پر بھرپور تالیاں بجا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر ان پاکستانیوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک گئے جو آج سے سات سال قبل ایک دوسری سولہ دسمبر کو دیکھ چکے تھے۔ سولہ دسمبر کی تلخ تاریخ اور بنگلہ دیش کی حلقۂ اسلام میں واپسی ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔

کانفرنس سے اسلامی سیکرٹریٹ کے سیکرٹری جنرل جناب عبدالکریم گایا نے بھی خطاب کیا، جنہیں حکومتِ پاکستان نے پروٹوکول میں ان کا مرتبہ وزیرِ اعظم کا مقرر کر رکھا تھا۔

کانفرنس کے تنظیمی مسائل پر عملی مشکلات سامنے آنا لازمی بات تھی۔ اسلامی ایوان تجارت و صنعت کا آئین بننا ایک مشکل مسئلہ تھا۔ پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش کا وفد اپنے ساتھ ایک آئینی ڈھانچہ لایا تھا۔ بنگلہ دیش کے ظہیر الدین کی قیادت میں ایک دس رکنی آئینی کمیٹی نے ایک مشترکہ آئینی ڈھانچہ تیار کیا جسے مختلف ترامیم و تجاویز کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

اس آئین کے تحت ترکی کی تجویز اور ایران کی تائید پر کراچی کو اسلامی ایوان کا صدر مقام قرار دیا گیا۔ اسلامی ایوان کے اس مرکز کو کراچی کے علاقے کلفٹن میں وفاق ایوان تجارت و صنعت پاکستان کے زیرِ تعمیر بلڈنگ میں قائم کیا جائے گا اور اس کا نام "اسلامی تجارتی مرکز" رکھا جائے گا۔

آئین کے تحت ایک صدر، ۶ نائب صدر اور عاملہ کے ۲۱ ارکان ہوں گے۔ عاملہ کے ۱۹ ارکان منتخب ہوں گے اور اس میں سیکرٹری جنرل اور اسلامی کانفرنس کا ایک نمائندہ شامل ہوگا۔

صدارت کے لیے سعودی عرب کے شیخ اسماعیل ابوداؤد جو کہ جدہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر ہیں اور سعودی وفد کے قائد ہیں، منتخب کیا گیا۔ سیکرٹری جنرل ترکی سے لیا جائیگا۔

اسلامی ممالک کو چھ مختلف علاقوں میں تنظیمی طور پر تقسیم کیا گیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں :

افریقہ کا زون نمبر ایک۔ اس میں مصر، سوڈان، لیبیا، مراکو، تیونس، الجزائر، موریطانیہ، صومالیہ، جبوتی اور کومورو جزائر۔

اس زون کے نائب صدر مصر کے جناب عزت غیدان ہوں گے، جب کہ ان کی عاملہ میں لیبیا کے فراغ الفتونی اور تیونس کے حبیب ماموں ہوں گے۔

افریقہ کا زون نمبر دو۔ چاڈ، مالی، نائیجیریا، سینی گال، گینی، کیمرون، گیمبیا، گیبون، اپر وولٹا، گنی بساؤ، یوگنڈا۔

نائب صدر۔ سینگال کے جناب سورنج منتخب ہوئے۔

عاملہ:۔ کیمرون کے محمد اور یوگنڈا کے عباس حسن۔

مشرق اوسط زون نمبر تین۔ اُردن، لبنان، سعودی عرب، شام، شمالی یمن، عرب جمہوریہ یمن، تنظیم آزادئ فلسطین۔

نائب صدر۔ بدرالدین شلاہ (شام)

سعودی عرب کا وفد

عاملہ۔ اُردن کے محمد بودیر اور عرب جمہوریہ یمن کے حبابی۔

خلیج فارس کا زون نمبر ۴۔ عراق، کویت، قطر، متحدہ عرب امارات

نائب صدر کویت سے اور عاملہ کے ارکان عرب امارات اور عراق سے لیے جائیں گے۔

مغربی ایشیا زون نمبر ۵۔ ترکی، ایران، پاکستان، افغانستان، ترک قبرص۔

نائب صدر۔ پاکستان کے محمد مظفر اور عاملہ میں۔

جنوبی ایشیا زون نمبر ۶۔ انڈونیشیا، بنگلہ دیش، ملائیشیا، مالدیپ۔

نائب صدر بنگلہ دیش کے ایم اے وہاب۔ انڈونیشیا کے ڈاکٹر وصی اور ملائشیا کے راجہ خالد۔ عاملہ کے ارکان ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ طے ہوا کہ اسلامی ایوان تجارت کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس آئندہ سال مارچ ۱۹۷۹ء میں جدہ میں ہوگا۔

کانفرنس کا سیکرٹری جنرل باقاعدہ ملازم ہوگا اور ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والا عملہ پاکستانی ہوگا۔ اسلامی تجارتی مرکز کے لیے صدرِ پاکستان نے ۵ لاکھ روپے کا عطیہ دیا اور پاکستان کے وفاقی ایوان تجارت وصنعت نے دس ہزار ڈالر کا عطیہ تھا۔ اگلے سال کے لیے دو لاکھ ڈالر کا بجٹ منظور ہوا۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ اسلامی ایوان کے موجودہ تمام عہدیدار دو سال کے لیے اپنے عہدوں پر کام کرتے رہیں گے۔ اگر کوئی ملک اپنے کسی عہدیدار کو تبدیل کرنا چاہے تو وہ اجازت لے کر کر سکیں گے۔

اسلامی ایوان تجارت وصنعت نے اپنی کانفرنس کے درج ذیل مقاصد متعین کیے جن پر بحث ومباحثہ ہوا اور تجاویز مرتب کی گئیں۔

۱۔ اسلامی ممالک کے درمیان تعاون کو فروغ دینا۔

۲۔ اسلامی ممالک کے اقتصادی اور تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے کوششیں کرنا۔

۳۔ رُکن ممالک کی باہمی تجارت کی حوصلہ افزائی۔

۴۔ رُکن ممالک میں سرمایہ کاری اور مشترکہ منصوبوں کا فروغ۔

۵۔ بنکاری، انشورنس، جہاز رانی، ٹرانسپورٹ میں تعاون۔

۶۔ اسلامی ایوان کے اغراض ومقاصد کی ترویج کے لئے ہر ممکن اقدامات کرنا۔

۷۔ اسلامی اقتصادی برادری کو تسلیم کرانے کی طرف بتدریج قدم بڑھانا۔

۸۔ تجارتی وصنعتی لین دین کے دوران میں پیدا ہونے والے تنازعات کو اگر وہ چاہیں تو طے کرنا۔

۹۔ مشترکہ میلے، نمائشیں، مشترکہ شوروم، مذاکرے، لیکچر اور اشتہاری مہمات کو منظم کرنا۔

۱۰۔ رکن ممالک کے درمیان تجارتی، صنعتی، فنی، سائنسی معلومات تعلیمات اور ہنرمندی کو فروغ دینا۔

اسلامی ایوان کے دستور کے متعلق طے کیا گیا کہ یہ اسلامی سیکرٹریٹ کے دستور کے طرز پر ہونا چاہیئے۔ اسی لئے مسلم ممالک کو مختلف زونوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اسلامی ایوان کی ایگزیکٹو نے یہ طے کیا کہ اسلامی ایوان کے تمام عہدیداروں اور سیکرٹری جنرل کو سفارتی پاسپورٹ جاری کیے جائیں گے اور شناختی کارڈ بھی دیے جائیں گے۔

کانفرنس نے مندرجہ بالا امور پر عملدرآمد کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم کیں۔ دوسری اسلامی ایوان تجارت کی کانفرنس کی صدارت پہلی کانفرنس کے صدر عمر بیسی نے کی اور پاکستان کے محمد ظفر کو کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا اور سعودی عرب کے وفد کے قائد شیخ اسماعیل ابوداؤد اور گیبون کے وفد کے قائد یوسف غفار منگنار کو وائس چیئرمین منتخب کیا، بنگلہ دیش کے وفد کے قائد عبدالوہاب اور شام کے وفد کے قائد بدرالدین کو کانفرنس کا ترجمان منتخب کیا گیا۔

اس طرح اسلامی یکجہتی اور بھائی چارہ کی فضا میں تیئس ممالک کے تقریباً سو سے زیادہ مندوبین ایک نیا اسلامی، معاشی نظام قائم اور فروغ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

ان کی اس بحث ومباحثہ کے لئے بہت سی کمیٹیاں بنائی گئیں کانفرنس نے غیر سودی مرکزی بنک کے قیام کی عرب امارات کی تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک دس رکنی کمیٹی قائم کی۔

مشترکہ جہاز رانی اور ٹرانسپورٹ کے فروغ کے لئے پاکستان کے مصطفے اگوکل کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک ۱۱ رکنی کمیٹی قائم کی گئی جو مشترکہ سرمایہ کاری اور ری انشورنس کمپنی کے قیام کا جائزہ لے گی۔ اس میں افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، اسلامی ترقیاتی بنک، کویت، سینیگال، شام، عرب امارات، ملائیشیا اور یونین آف عرب چیمبرز شامل ہوں گے۔

ان کمیٹیوں نے شب وروز کی محنت سے درج ذیل فیصلے کیے۔

۔ رکن ممالک کے درمیان مصنوعات کی تشہیر، مارکیٹ ٹیکنیک ٹرانسپورٹ کی سہولتوں اور ذرائع تجارت کو فروغ دیا جائے گا۔

۲۔ نمائشوں، میلوں، مذاکروں، تجارتی وفود کے تبادلوں کا اہتمام کیا جائے گا۔

۳۔ تاجروں کے لئے ویزے اور محصولوں کی پابندیوں کو نرم کیا جائے گا۔

۴۔ مشترکہ سرمایہ کاری کی جائے گی۔

۵۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اوپیک ممالک کی جانب سے دی جانے والی امداد کو اسلامی ممالک کے درمیان تجارت کے فروغ کے لئے استعمال کیا جائے گا اور ان ممالک کے لئے مشروط کیا جائے گا کہ اسلامی ممالک ایک دوسرے سے سامان خریدیں اور غیر اسلامی ملکوں کی طرف تبھی رجوع کیا جائے، جبکہ اسلامی ممالک وہ سامان دینے سے قاصر ہوں۔

۶۔ اسلامی ممالک میں قائم کمپنیوں کے لئے ری انشورنس پول قائم کیا جائے۔

۷۔ پروگرام پر عملدرآمد کے لئے ایک درآمدی وبرآمدی کمیٹی قائم کی جائے۔

یہ تو تھے اسلامی ایوان تجارت وصنعت کے فیصلے اور تجاویز۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں شریک مندوبین اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور ان کے کیا جذبات ہیں۔

اس سلسلے میں نمائندہ زندگی نے مختلف مندوبین سے ان کی رائے پوچھی جو کہ مختلف تقاریب میں ان کی فراغت کے لمحوں میں ان سے بات چیت کے دوران میں معلوم ہوئی۔

ملائیشیا کے مندوب دانک راجہ نے اسلامی ایوان تجارت و صنعت کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں کہا کہ یہ بہت پہلے ہو جانی چاہیئے تھی اور امید ہے اس کے مثبت نتائج نکلیں گے۔

بنگلہ دیش کے دس رکنی وفد کے قائد نے انگریزی میں گفتگو

شروع کی جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ تو کراچی آتے رہے ہوں گے، تو انہوں نے بتایا کہ وہ کراچی بہت دفعہ آئے ہیں اور ان کے یہاں پر بہت سے دوست ہیں، تو میں نے ان سے کہا کہ آپ تو پھر اردو بھی جانتے ہوں گے جو کہ انگریزی سے زیادہ اسلامی زبان ہے، تو ہم کیوں نہ اردو بھی بولیں۔ اس پر انہوں نے کچھ باتیں اردو میں بھی کہیں، لیکن کہا کہ میں انگریزی میں بولنا زیادہ پسند کروں گا۔ بہرحال انہوں نے پاکستان سے تجارت میں کمی کی وجہ یہ بتائی کہ پاکستان کی قیمتیں زیادہ ہیں۔ ہم اسی لئے چین، جاپان اور سنگاپور سے ٹیکسٹائل کی اشیاء منگواتے ہیں اور سیمنٹ نارتھ کوریا سے درآمد کرتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش میں زیادہ تجارت کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ جہاز رانی میں مشترکہ سروس شروع کرنی چاہیئے جس سے دونوں ملکوں کو خرچہ کم پڑے گا۔

انڈونیشیا کے مندوب میجر جنرل حاجی سکومتو نے اس کانفرنس کی بڑی تعریف کی کہ یہ بہت عمدہ طور پر منعقد ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم پاکستان کو کھاد، سیمنٹ اور شکر فروخت کر سکتے ہیں اور ان کے لئے پلانٹ بھی مہیا کر سکتے ہیں۔

ماریطانیہ کے وفد کے لیڈر محمد سالم بن الخیطرات نے مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان ملکوں کو قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق چل کر ہی ترقی کرنی چاہیئے اور ہم سب اسلام ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب ہیں انہوں نے بتایا کہ اس وقت ہم پاکستان سے ٹیکسٹائل کی مصنوعات، چاول اور ڈبے کی غذا درآمد کر رہے ہیں اور پاکستان کو ہم لوہا مہیا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعاون کی مزید ترقی پر زور دیا۔ انڈونیشیا کے وفد میں پانچ مندوب تھے۔

سوڈان کے وفد کے لیڈر عبدالکریم حسین جعفر نے کانفرنس کی کامیابی پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس سے برادر اسلامی ممالک اور قریب آجائیں گے۔ انہوں نے کراچی کو اسلامی ایوان تجارت کا صدر مرکز بنائے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کراچی اس اعزاز کا مستحق ہے اور یہاں پر تجارتی سرگرمی کے لئے مناسب سہولتیں ہیں انہوں نے پاکستان اور سوڈان کے درمیان مشترکہ سرمایہ کاری کی ضرورت پر زور دیا، تاکہ ری انشورنس اور جہاز رانی کی کمپنی اور بنک قائم کئے جا سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت سوڈان ٹیکسٹائل اور چاول پاکستان سے منگواتا ہے اور گوند اور تیل کے بیج بھیجتا ہے۔

ترکی کے وفد کے قائد جناب ایکر سینسر IKER SENCER نے بھی ترکی اور پاکستان کے درمیان تجارت کے مزید فروغ کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ دونوں ملک پہلے ہی آر، سی، ڈی کے تحت تجارتی اور ثقافتی رشتوں سے منسلک ہیں، مگر اس کے مطلوبہ نتائج نہیں نکل سکے ہیں۔ ترکی کے لیڈر ہی نے کراچی کو اسلامی ایوان تجارت کا ہیڈ کوارٹر بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ترکی سے اس وقت پاکستان کو کیمیائی ادویہ ہی زیادہ تر برآمد کی جا رہی ہیں، جبکہ پاکستان سے آلات جراحی، مہندی اور کھیلوں کا سامان ترکی جاتا ہے۔

شام کے لیڈر تہبت ماہانی THABET MAHAYNI نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ ان کا ملک اس وقت ریفریجریٹرز، واشنگ مشین اور دوسرا گھریلو بجلی کا سامان بنا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کھاد، کاٹن اور پیٹرولیم بھی مختلف ملکوں کو برآمد کرتا ہے۔ شام جیسے چھوٹے ملک میں ان مصنوعات کی تیاری واقعی مسلم ملکوں کے لئے ایک اعزاز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان سے اب تک صرف چاول یا پٹ سن ہی شام کو جاتا ہے۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کے لئے درپیش مشکلات ختم کرنے اور نئی تجارتی پالیسی بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

ایران کے مندوب لیڈر حسین الغنید نے کہا کہ ایران اور پاکستان کے درمیان آر سی ڈی موجود ہے، مگر اس سے مطلوبہ نتائج نہیں مل سکے ہیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ سب اسلامی ملک مل کر ایک پلاننگ کریں، تاکہ ایک ملک صرف ایک طرح کی مصنوعات بنائے اور دوسرا ملک دوسرے انداز کی اشیاء بنائے۔ اس سے اشیاء کی لاگت کم ہو جائے گی اور یہ سب ملک ایک دوسرے سے ہی وہ اشیاء خریدیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں مزدوری بہت سستی ہے یہاں پر صنعتیں قائم ہونی چاہیئیں۔ ترکی کا وفد دس افراد پر مشتمل تھا۔

اُردن کے لیڈر ابراہیم تقی الدین نے کہا کہ کراچی کو ہیڈ کوارٹر بنانے کا فیصلہ صحیح اقدام ہے۔ انہوں نے کہا کہ اُردن اور پاکستان کے درمیان تجارت بہت کم ہے اسے بہت زیادہ فروغ دینا چاہیئے۔ جناب ابراہیم نے کہا کہ اس وقت پاکستان اُردن سے فاسفیٹ درآمد کرتا ہے، جبکہ پاکستان نے اُردن میں بہت سے صنعتی اور تعمیراتی منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ اُردن کا وفد دو افراد پر مشتمل تھا۔

سعودی عرب کے وفد کے قائد شیخ اسماعیل ابوداؤد جو کہ جدہ چیمبرز آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری کے صدر ہیں، نے اسلامی ایوانِ تجارت کانفرنس کے انعقاد پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ان سے ملنا ایک بہت دشوار کام تھا اور ان سے چند کلمات نکلوانا اس سے بھی مشکل، تاہم انہوں نے اسلامی ممالک کے درمیان باہمی تعاون کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اب جو معاشی تعاون کی نئی راہ شروع ہوئی ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے، اگرچہ اس میں کچھ وقت لگے گا، کیونکہ مختلف ملکوں کے مسائل اور قوانین مختلف ہیں۔

مندوبین کے ان تاثرات کے بعد دیکھنا ہے کہ آیا ان کے جذبات اور خواہشات کی روشنی میں عملی صورت حال کیا ہے۔ اس بارے میں جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ملکوں کے درمیان معاشی اور تجارتی تعاون کی راہ میں بہت زیادہ مشکلات درپیش ہیں اور اس کے لئے ان ملکوں کی پسماندگی، غربت اور دوسرے مسائل اس کی راہ میں ایک بڑی چٹان ہیں۔ اس تجارتی تعاون کے لئے مسلسل کوشش کرنی ہوگی۔ امیر ملکوں کو قربانی دینا ہوگی، کیونکہ چھوٹے اور غریب اسلامی ملک جن کی زیادہ تر معیشت زراعتی ہے، کسی بڑی بڑی تجارتی سرگرمی کے قابل نہیں اور بڑے امیر اسلامی ملکوں میں بھی تیل کی دولت کے سوا کوئی قابلِ فخر صنعت اور تجارتی سرگرمی نہیں ہے۔

مثلاً اسلامی ایوانِ تجارت و صنعت کی کانفرنس میں شریک ہونے والے ملکوں میں بنگلہ دیش سب سے غریب ملک ہے جس کی فی کس سالانہ آمدنی ۷۰ ڈالر ہے، جب کہ آبادی سات کروڑ اڑسٹھ لاکھ ہے۔ اہم فصلوں میں پٹ سن چاول اور چائے ہے۔ صنعتوں میں چھوٹے پیمانے پر ٹیکسٹائل، فرٹیلائزر اور پٹ سن کی صنعتیں شامل ہیں اور اس کی معیشت ۷۰٪ زرعی ہے۔ برآمدات میں وہ امریکہ کو ۲۰٪، برطانیہ کو ۹٪ فی صد اور بھارت کو ۸٪ اشیاء بھیجتا ہے، جب کہ اس کی درآمدات میں امریکہ سے ۲۴٪ فی صد، جاپان ۱۳٪ فی صد اور آسٹریلیا ۹٪ حصہ لیتا ہے، یعنی کسی اسلامی ملک سے قابلِ ذکر درآمدی و برآمدی تجارت نہیں ہے۔

اسی طرح افغانستان کا اگر جائزہ لیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی فی کس آمدنی صرف ۸۰ ڈالر ہے۔ صنعتوں میں قالین، کھال کے کوٹ، ٹیکسٹائل اور سیمنٹ ہیں۔ درآمدات میں روس کا حصہ ۲۵٪ جاپان ۱۵٪، امریکہ ۱۱٪ اور جرمنی ۹٪ ہے، جب کہ برآمدات میں روس کو ۲۹٪، برطانیہ کو ۱۶٪ اور بھارت کو ۲۴٪ حصہ جاتا ہے، جب کہ کل درآمدات ۲۹ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں اور برآمدات صرف ۲۱ کروڑ ڈالر ہیں۔ انڈونیشیا کی فی کس آمدنی ۱۵۰ ڈالر ہے، جب کہ اس کی کل درآمدات پانچ ارب ۶۷ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں اور برآمدات آٹھ ارب ۴۵ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں اس طرح اس کی درآمدات میں جاپان کا حصہ ۳۰٪ فیصد، امریکہ کا ۱۶٪ اور جرمنی کا ۸٪ ہے۔ اہم صنعتوں میں ٹیکسٹائل، فوڈ پروسیسنگ اور ہلکی انڈسٹری شامل ہے۔

ایران کی فی کس آمدنی ۱۲۹۵ ڈالر فی کس ہے۔ اس کی کل درآمدات ۱۳ ارب ۴۳ کروڑ ڈالر اور برآمدات ۲۳ ارب ۵۲ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔ اہم صنعتوں میں اسٹیل، پیٹرو کیمیکل، قالین، شکر، موٹر سازی ہے۔ ایران کی درآمدات میں امریکہ سے ۲۰٪، جرمنی سے ۱۸٪ اور جاپان سے ۱۵٪ فی صد اشیاء آتی ہیں، جب کہ برآمدات میں جاپان کو ۲۰٪ فی صد، ہالینڈ کو ۱۱٪ اور امریکہ کو ۱۰٪ فی صد اشیاء جاتی ہیں۔

سعودی عرب کی فی کس آمدنی ۲۴۸۴ ڈالر ہے —— اس کی درآمدات ۱۱ ارب ۷۵ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں اور برآمدات

افریقہ اور عرب ممالک جانے کے خواہشمند گھر بیٹھے بذریعہ خط و کتابت کورس مکمل کرلیں اور خود اعتمادی کے ساتھ زبان کا مسئلہ حل کر کے باہر روانہ ہوں

پیارے نبیؐ کی پیاری زبان

ڈاکٹر، انجینئر، مکینک، مستری، دفاتر اور بنکوں کے ملازمین کے لئے

عربی خط و کتابت کورس

جدید عربی اڈیشن

عربی خط و کتابت مکمل کورس مع حل و پرچہ جات ۔ /۳۰ روپیہ
عربی خط و کتابت کورس جدید عربی اڈیشن ۔ ۴۰ روپیہ
—— پراسپیکٹس بلا قیمت ——

پرنسپل عربی خط و کتابت سکول
۸۰۔ ۲۵ محمد نگر۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور
فون نمبر ۲۳۵۱۸ / ۶۲۶۳۰

۳۶، ارب ڈالر سے زیادہ ہیں۔ اہم صنعتوں میں تیل اور اس کی مصنوعات شامل ہیں۔

سعودی عرب کی درآمدات میں امریکہ کا حصہ ٪۱۹، جاپان کا ٪۱۴ اور لبنان کا حصہ ٪۱۲ ہے۔ برآمدات میں فرانس کو ٪۹،۴، ماریطانیہ کو ٪۷، اور آیبوری کوسٹ کو ٪۸ فی صد حصہ جاتا ہے۔

کویت کی فی کس آمدنی ۱۱ ہزار ۶۳ ڈالر فی کس ہے۔ درآمدات ۲، ارب ۲۹ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں اور جب کہ برآمدات ۹، ارب ۸۵ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔ درآمدات میں جاپان سے ٪۱۷، امریکہ سے ٪۱۴ اور جرمنی سے ٪۱۱ فیصد اشیاء آتی ہیں۔ برآمدات میں جاپان کو ٪۲۶، برطانیہ کو ٪۱۶ اور فرانس کو ٪۱۰ حصہ جاتا ہے۔

خاص صنعتوں میں تیل کی مصنوعات شامل ہیں۔

متحدہ عرب امارات کی فی کس آمدنی ۱۶ ہزار ڈالر ہے۔ اس کی کل درآمدات ۴، ارب ۳۲ کروڑ ڈالر اور برآمدات ۸، ارب ۵۳ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔

ترکی کی فی کس آمدنی ۳ ۵ ۵ ڈالر ہے۔ کل درآمدات ۵، ارب ۲ کروڑ ڈالر اور برآمدات ایک ارب ۹ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔ درآمدات میں جرمنی سے ٪۱۸، امریکہ سے ٪۹ اور عراق سے ٪۹ اشیاء آتی ہیں جب کہ برآمدات میں جاپان کو ٪۳۳، فرانس کو ٪۲۱ اور جرمنی کو ٪۱۵ اشیاء جاتی ہیں۔ اہم صنعتوں میں ریشم، ٹیکسٹائل، اسٹیل جوتے اور فرنیچر شامل ہیں۔

پاکستان کی فی کس آمدنی ۱۵۶ ڈالر ہے۔ کل درآمدات ۲، ارب ۷۲ کروڑ ڈالر اور برآمدات ایک ارب ۳۳ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہیں۔

یہ تھا چند اسلامی ملکوں کا معاشی جائزہ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں کی آپس میں باہمی تجارت نہ ہونے کے برابر ہے اور ان کی طرح دوسرے سب اسلامی ملکوں کی درآمدات مغربی یا غیر اسلامی ممالک پر منحصر ہیں اور اسی طرح برآمدات میں زیادہ تر یورپی ممالک کو جاتی ہیں۔ ان ملکوں میں اہم صنعتیں بہت چھوٹے پیمانے پر ہیں اور کسی اسلامی ملک سے تجارت ہے بھی، تو وہ خشکی کے راستے ہوتی ہے۔ بنگال سعودی عرب، کویت، لبنان وغیرہ آپس میں خشکی سے باہمی تجارت کے رشتے سے منسلک ہیں۔

پاکستان نے پچھلے چند سالوں میں اسلامی ممالک سے تجارت کو فروغ دیا ہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصے میں پاکستان کی مشرق وسطیٰ کے ممالک کو برآمدات صرف ٪۳،۵ ۱ فی صد تھیں جب کہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں یہ ٪۴۰٫۳۶ فیصد ہو چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی دنیا کی کل برآمدات میں حصہ ۱۹۶۳ء میں صرف ٪۵٫۹ فی صد تھا جو کہ ۱۹۷۷ء میں ٪۱۳ فی صد ہو چکا ہے۔

مسلمان ملکوں میں پیدا ہونے والی غذائی اجناس کا جائزہ لیا جائے، تو ۸ مسلمان ملکوں میں گندم، چاول، جو، مکئی، باجرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان ممالک کی مجموعی غذائی پیداوار دنیا کی کل غذائی پیداوار کا دس فی صد ہے۔ ان ۸ ممالک میں سے عراق اور شام کے سوا اور کوئی ملک گندم برآمد نہیں کر پاتا۔ پاکستان چاول برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ یوگنڈا کیمرون اور انڈونیشیا کافی پیدا کرنے والے ممالک میں سرفہرست ہیں اور دنیا کی کافی کی کل برآمدات کا ٪۸ فیصد برآمد کرتے ہیں۔

خام مال مہیا کرنے میں اسلامی ممالک کا شمار چوٹی کے ممالک میں ہوتا ہے۔ خام اشیاء میں پٹ سن، کپاس، اُون، ابرک، کھوپرا اور تارکا تیل وغیرہ شامل ہیں۔ پٹ سن اور اس کی مصنوعات میں بنگلہ دیش سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے اور کپاس میں مصر سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے اور دنیا کی کل کپاس کا ٪۴۰ مصر میں پیدا ہوتا ہے۔ کپاس مصر، ترکی، سوڈان اور ایران میں پیدا ہوتی ہے۔ اون کی پیداوار میں ترکی کو دنیا میں دوسری پوزیشن حاصل ہے۔ اس کی عالمی پیداوار کا ٪۷۰ اسلامی ممالک سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی ممالک کی خام اشیاء اور غذائی اجناس کی کیفیت آپ نے دیکھ لی ساٹھ کروڑ نفوس پر مشتمل یہ ممالک ان سب خصوصیات کے باوجود اب بھی مغربی ممالک کے محتاج ہیں، ان کے لئے اپنی خود مختاری اور وقار برقرار رکھنا بہت دشوار امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے چند ایک اسلامی ممالک کے، اکثر مسلمان ملک کاسۂ گدائی لئے اپنوں اور غیروں کے پاس چکر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۲۹ سال پہلے منعقد ہونے والی اسلامی اکنامک کانفرنس میں بھی بہت کچھ طے ہوا تھا، لیکن عملی طور پر کوئی ٹھوس چیز سامنے نہ آسکی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں آر سی ڈی بھی انہی نعروں اور جذبوں کے ساتھ وجود میں آئی تھی، لیکن اب اس ادارے سے منسلک لوگ اس کا ذکر کرتے ہوئے کچھ شرماتے ہیں۔ آر سی ڈی چیمبر بھی موجود ہے اور اس کے تاحیات صدر لطیف ابراہیم جمال بھی زندہ ہیں، لیکن آر سی ڈی مر چکی ہے۔ آر سی ڈی تجارتی کم اور فوجی زیادہ رہی اور قریبی مسلم ممالک اس سے خوفزدہ رہے۔ آر سی ڈی ممالک کے درمیان تجارت نہ ہونے کے برابر ہے اور آپس کا تجارتی توازن بھی ٹھیک نہیں ہے اور سارے دعووں کے باوجود شپنگ اور انشورنس میں تینوں ملکوں کے اشتراک سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پاکستان کو صرف یہ فائدہ ہوا کہ ایران اور ترکی نے اپنے کچھ جہازوں کی مرمت وغیرہ پاکستان سے کرالی۔

یوں تو دنیا بھر کے تاجروں کی ایک تنظیم انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری موجود ہے اور اس کے عہدیدار سال دو سال میں دنیا بھر کا دورہ بھی کر لیتے ہیں۔ یہ سب رسمی باتیں ہی ہیں۔ اب اسلامی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے بارے میں بھی عام آدمی کے یہی خدشات ہیں۔ اگر اس تنظیم سے اسلامی ممالک کے عوام کو کوئی فائدہ نہ پہنچا، تو یہ ایک بے مقصد تجربہ ہوگا۔ عوام کو فائدہ پہنچانے کے لئے تجارت کو منافع کے پھندے سے نکال کر عوامی بہبود کے عنصر سے آشنا کرنا ہوگا جو کہ اسلامی ممالک کی موجودہ معاشی اور تجارتی فضا میں ایک انقلابی بات نظر آتی ہے۔ اسلامی ممالک کے درمیان تجارت ایک رسمی رشتہ سا ہے۔ پاکستان کی برآمدی تجارت کا صرف ٪۲۲ فی صد مسلم ممالک کا حصہ ہے، جب کہ پاکستان کی اپنی منڈی میں چین، جاپان، امریکہ، برطانیہ یہاں تک کہ تائیوان کی مصنوعات بھی نظر آتی ہیں، لیکن صارفین ابھی تک ایسی اشیاء دیکھنے سے قاصر ہیں، جن پر ساختہ سعودی عرب یا ترکی ہو یا سوڈان اور مصر کی اشیاء انہیں نظر آئیں۔

اسلامی ممالک کو تین حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جس کی کل آمدنی کا انحصار صرف تیل پر ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ باقی تمام اشیاء وہ درآمد کرتے ہیں۔ ان کی خریداری کا رخ اب تک ہمیشہ یورپ کی طرف ہوتا ہے۔ انہیں اس سے سروکار نہیں رہا کہ برادر اسلامی ممالک کیا برآمد کرنا چاہتے ہیں اور کیا نہیں اور تیل کی قیمت میں اضافے سے برادر اسلامی ملکوں کی معیشت پر کیا اثر پڑے گا۔

اسلامی ممالک کا دوسرا حصہ ان پسماندہ ملکوں پر مشتمل ہے جن کی معیشت قطعی زرعی ہے اور انتہائی پسماندہ بھی۔ ان ممالک میں افریقہ کے ملک شامل ہیں۔ یہ ممالک صرف خام مال برآمد کر سکتے ہیں، لیکن اچھے داموں پر، اور وہ بھی یقیناً یورپی خریداروں کو ترجیح دینا پسند کریں گے۔

تیسرا حصہ ان اسلامی ملکوں پر مشتمل ہے جو نیم زرعی اور نیم صنعتی معیشت کے حامل ہیں، لیکن ان ممالک کی اپنی مصنوعات اتنی معیاری اور پرکشش نہیں ہیں کہ امریکہ، جاپان اور یورپ کی مصنوعات کا مقابلہ کرسکیں۔

ایسی صورت میں تجارتی تعاون محض ایک خواب ہے جب تک اس کے لئے عملی اقدامات نہ کئے جائیں، یہ حقیقت نہیں بن سکتا اور عملی اقدامات کی سب سے بہتر صورت مشترکہ تجارتی منصوبے، سرمایہ کاری اور فنی ماہرین کا اشتراک نہایت ضروری ہے۔ مسلم ممالک کے کچھ ملک زبردست اقتصادی قوت کے مالک ہیں۔ اگر ان کا نجی اور سرکاری شعبہ مشترکہ سرمایہ کاری کے لئے اسلامی ممالک کا انتخاب کرلے، تو اسلامی ایوان تجارت کے کراچی کے اجلاس کے فیصلے اور سفارشات ان ملکوں کی زندگی بدل سکتے ہیں اور مسلم ممالک ایک نئی قوت بن کر حقیقی طور پر ابھر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ اسلامی پلاننگ کمیشن قائم کیا جائے جو سب ممالک کی معاشی اور تجارتی حالت اور ضروریات کا جائزہ لیتا رہے اور ان کے لئے فنڈ مہیا کرتا رہے۔

اسلامی ممالک کے ماہرین کو واپس اپنے پاس بلایا جائے۔ پاکستان میں اس وقت خدا کے فضل سے خام مال اور لیبر کی فراوانی ہے۔ تکنیکی قابلیت اور ماہرین کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے جس نے پوری دنیا سے اپنی اہلیت کا لوہا منوایا ہے۔

ضرورت صرف سرمائے کی ہے جو کہ برادر اسلامی ممالک سے بھی آسکتا ہے اور ملک میں موجود تاجر برادری سے بھی مل سکتا ہے۔ امید ہے اگر اسلامی ممالک نے مشترکہ سرمایہ کاری کے کچھ منصوبے شروع کر دیئے، تو پاکستان کی عام معاشی فضا اور متفکر تاجروں کے بھی دل سنبھل جائیں گے اور وہ اپنا پیسہ کہیں اور بھیجنے کے بجائے پاکستان میں اسے زیر استعمال لے آئیں گے۔

●●

تھانیدار کی مدد سے پیپلز پارٹی کے وکیل کی غنڈہ گردی

تونسہ شریف میں شرفا کی عزت اور زندگی محفوظ نہیں رہی

پیپلز پارٹی جس کی کج بنیادی درسِ آوارگی پر رکھی گئی تھی، جس کے بیخ و بن کی معصوم انسانوں کے خون سے آبیاری کی گئی، جس کی تاسیس میں قومی انہدام و سقوط کا خمیر پوشیدہ تھا، جس نے اپنے پیرووں کو اخوت و آشتی کے بجائے عداوت و مخاصمت کا درس دیا۔ آج پھر چند مفسد پردازوں کی شہ پر یہاں دندنا رہی ہے، وہ دورِ بہیمیت و درندگی کو دہرانا چاہتی ہے جس نے اس سرزمین کو شہرِ پرآشوب بنا دیا تھا، وہ مکر و حیلہ و فن کے ان حربوں کو استعمال میں لا رہی ہے جہاں شرفا کا کوئی ٹھکانا نہیں، مگر بدطینت افراد چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کی حالیہ شرمناک غنڈہ گردی کا مظاہرہ تونسہ شریف میں ہوا جس کی پشت پر چند بدنام جاگیردار تھے۔ اس سے پیشتر وہ کئی دفعہ غنڈہ گردی میں ملوث رہے ہیں۔ واقعات کے مطابق پانچ دسمبر کو عبدالحق خوجہ ایک اشتعال انگیز اشتہار اٹھائے لوگوں کے ہجوم میں آیا۔ یہ اشتہار اس نے ۱۹۷۰ء میں خود چھپوایا تھا۔ اس میں شرمناک طریقے پر مقامی قائدین سے لے کر چند بین الاقوامی ہستیوں تک کیچڑ اچھالا گیا۔ اس نے یہ اشتہار پڑھنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں وہ مقامی احاطۂ عدالت میں آیا اور وکلا کی نشستوں تک اس اشتہار کو پڑھ کر سناتا رہا۔ اسی دوران میں عارف وکیل نے جس کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے، وہ اشتہار اس سے لے لیا اور وہاں زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ حاجی احمد علی جو قومی اتحاد تونسہ شریف کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں اچانک احاطۂ وکلا میں پہنچ گئے اور وکیل مذکور سے اشتہار مانگا تاکہ فوٹو کاپی کرا کے وہ قانونی چارہ جوئی کر سکے، اس پر عارف نے انکار کر دیا۔ اسی دوران میں تلخ کلامی ہوئی۔ اتنے تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ دونوں پولیس اسٹیشن پر گئے۔ وہاں مولانا عبداللطیف امیرِ جماعتِ اسلامی ڈیرہ غازیخاں اور دیگر شرفا نے مل کر کوشش کی اور ان دونوں میں صلح کرا دی تاکہ امنِ عامہ میں خلل واقع نہ ہو۔ عارف نے عذر پیش کیا کہ وہ لوکل بار کا اجلاس بلائے گا اس میں حاجی احمد علی معذرت کر لے۔ اس پر حاجی احمد علی نے کہا کہ وہ اس شرط کو ماننے پر تیار ہیں۔

لیکن دوسرے دن عارف کے ایما پر شہر تونسہ میں سوکڑ سے چالیس پچاس غنڈے لائے گئے، وہ شہر میں گشت کرتے رہے، وہ حاجی احمد علی کی بے عزتی کرنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے وہ اس دن ڈیرہ غازیخاں گئے ہوئے تھے۔ غنڈے سارا دن عارف کے مکان پر منصوبے باندھتے رہے۔ رات کو کچھ آدمی وہاں قیام پذیر رہے اور کچھ سوکڑ کو واپس چلے گئے۔ سوکڑ میں اکرم خاں کے مکان پر اسکی موجودگی میں باقاعدہ میٹنگ ہوئی۔ واضح رہے کہ عارف اور اکرم آپس میں بھائی ہیں اور اکرم مقامی پیپلز پارٹی کا چیئرمین بھی ہے۔ اسی دن چھ تاریخ کو عبداللطیف صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی ضلع ڈیرہ غازیخاں، حاجی عبدالرحیم صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی شہر تونسہ اور مولوی غلام مصطفےٰ خاں بار کے اندر جا کر مختلف وکلا کو ملے اور اس طرف توجہ دلائی کہ علاقے کا امن تہس نہس نہ ہونے دیا جائے۔ وہ عارف کو بھی ملے اور اسے بھی ان حالات سے آگاہ کیا گیا اور اپیل کی گئی کہ حالات کو خراب نہ کیا جائے۔ طے شدہ فیصلے کے مطابق حاجی احمد علی اور آپ کی صلح صفائی کرا دی جائے تاکہ سارا معاملہ امن و امان کے ساتھ طے پا جائے۔

سات دسمبر کو دن کے گیارہ بجے بار کا اجلاس شروع ہوا۔ ملک عبدالغفور ایڈووکیٹ بار کی طرف سے امیرِ جماعتِ اسلامی کی دکان پر آئے۔ حاجی احمد علی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر کہا کہ بار والے منتظر ہیں، آپ آ جائیں۔ وعدے کے مطابق عبداللطیف صاحب، حاجی احمد علی اور اس کا لڑکا عزیز اور فیض محمد کھوسہ بار کی طرف روانہ ہوئے۔ جونہی وہ سول جج اور اے سی کی عدالت کے درمیان پہنچے ان پر غنڈوں نے حملہ کر دیا جو کافی تعداد میں پہلے سے ایک منصوبے کے تحت وہاں موجود تھے۔ عارف نے سامنے سے گزر کر مفرور ہونے کی کوشش کی جو غنڈوں میں موجود تھا۔ اس کا بڑا بھائی اکرم جو سوکڑ سے غنڈے لے کر آیا تھا، منگروٹھہ روڈ پر واقع راشن ڈپو پر کھڑا تھا۔

اسی دوران میں عدالت سے وکلا اور عوام آئے اور انہوں نے یہ لڑائی اور غنڈہ گردی بند کروائی۔ حاجی احمد علی کو بہت زیادہ زدوکوب کیا گیا اور انہیں بار بار زمین پر پٹخا گیا۔ دوسرے افراد جو ان کے ہمراہ تھے انہیں دھکے دیئے گئے تاکہ وہ احمد علی کو نہ چھڑوا سکیں۔

پیپلز پارٹی کی غنڈہ گردی کے اس مظاہرے پر تونسہ شریف کا سارا شہر مشتعل ہو گیا جس پر عبداللطیف صاحب اور دوسرے افراد نے بڑی محنت و کاوش سے قابو پایا۔ عارف کو جو مفرور ہونے کی کوشش کر رہا تھا، عوام نے گھیر لیا۔ اس نے یونائیٹڈ بنک میں جا کر پناہ لی۔ عوام کے مطالبے اور پرزور اصرار پر پولیس نے اسے وہاں سے گرفتار کر لیا۔

پولیس کا رویہ

ایس ایچ او چودھری اکرم جس کے عارف اور اکرم سے قریبی روابط بیان کئے جاتے ہیں، کافی دیر تک ان کی گرفتاری سے معذوری ظاہر کرتا رہا۔ ایس ایچ او مذکورہ کی ان کو شہ حاصل ہے عبدالحق خوجہ جو بانیٔ فساد ہے اور اشتعال انگیز اشتہار چھپوانے والا ہے ہنگامے کے خاتمے تک عدالت میں موجود تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں دیکھا، مگر پولیس کی نااہلی و چشم پوشی سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے خلاف پرچہ ہو چکا ہے جو مارشل لا کے ضابطے کے تحت عمل میں لایا گیا ہے۔

عوامی ردِ عمل

پورا شہر امن کا خواہاں ہے۔ لوگوں کا مطالبہ ہے کہ تمام ملزموں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ اس وقت صرف دو ملزمان عارف اور اس کا منشی گرفتار ہو چکے ہیں اور چار دوسرے آدمی جن کا پرچہ ہو چکا تھا اور وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، انہیں چودہ میل دور پل قنبر سے گرفتار کر لیا گیا۔ باقی ملزمان ابھی تک مفرور ہیں اور تاحال گرفتار نہیں ہو سکے۔ وقوعہ کے روز لوگوں نے احتجاجاً ردِ عمل کے طور پر اپنی دکانیں بند کر دیں۔ جمعہ کے دن مساجد میں قراردادیں پیش ہوئیں کہ ملزمان کو گرفتار کیا جائے۔ تھانیدار مذکور کو یہاں سے تبدیل کر دیا جائے اور اس کے کردار کی تحقیقات کی جائے۔ اس بات کا بھی مطالبہ کیا گیا کہ اعلانیہ غنڈہ گردی کرنے والے عناصر اور وہ لوگ جو اس کی پشت پر ہیں، فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر قرار واقعی سزا دی جائے۔ تونسہ شریف اور ڈیرہ غازی خاں کی تمام سیاسی، سماجی تنظیموں اور شریف شہریوں نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا ہے کہ سوکڑ کے غنڈوں کو فوراً گرفتار کیا جائے اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اس غنڈہ گردی میں مقامی پولیس براہِ راست ملوث ہے، فوراً تحقیقات کی جائے۔ انجمن دکانداران تونسہ شریف نے بھی ایک اجلاس میں اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ بلوائیوں اور ان کے پشت پناہ ایس ایچ او کو عبرتناک سزا دی جائے۔ سٹوڈنٹس یونین گورنمنٹ انٹر کالج تونسہ شریف نے سخت احتجاج کیا ہے اور ایک قرارداد میں ——— مطالبہ کیا ہے کہ ملزمان کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے اور شریف شہریوں کو ان غنڈوں کی دستبرد سے بچایا جائے۔

●●

پنجاب بھر کے ہزار ہا سیمنٹ پرچون فروش

جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان

جناب پروفیسر غفور احمد وفاقی وزیر پیداوار

اور

جنرل سوار خان گورنر پنجاب سے

اپیل

کرتے ہیں کہ صوبے میں سیمنٹ کی بلیک ختم کرانے اور عوام کو درست قیمت پر
سیمنٹ فراہم کرنے کیلئے پرچون فروشوں کو براہ راست سیمنٹ سپلائی کیا جائے

صدر و اراکین **یونائیٹڈ سیمنٹ ریٹیلرز سوسائٹی** (رجسٹرڈ) **پنجاب**

مرکزی آفس سرکلر روڈ گوجرانوالہ۔ فون ۔ ۵۵۸۹۔

نمائندہ خصوصی

قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عمل جاری ہے

عالمی تنظیم ماہرینِ قانون اسلامی کے مذاکرے کی رُوداد

"اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دے اور شرعی قوانین نافذ کرے، لیکن ہمارے ملک میں گزشتہ ۳۱ برس کے دوران مختلف دساتیر میں صرف اس مقصد کا ذکر تو کر دیا گیا، عملاً کوئی قدم نہ اُٹھ سکا۔ اب قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عمل جاری ہو چکا ہے۔ اسے تیز کرنے کیلئے شریعت بنچ اہم کردار ادا کرے گا۔ میں پُرامید ہوں کہ مستقبل قریب میں اسلامی قوانین بتدریج نافذ ہوتے چلے جائیں گے"۔ یہ الفاظ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس شیخ انوار الحق کے ہیں، جنہوں نے ۲۸ دسمبر کو ایک مقامی ہوٹل میں "عالمی تنظیم ماہرینِ قانون اسلامی" کی جانب سے منعقد کیے گئے مذاکرے کی صدارت کی۔ اس مذاکرے کا عنوان تھا: "قانونِ شریعت کی حکمرانی"۔ وفاقی وزیر امورِ مذہبی نوابزادہ افتخار احمد انصاری کا نام رفیق صدر کے طور پر پروگرام میں شامل تھا، لیکن وہ اس میں شرکت نہ کر سکے۔

اس تقریب سے خطاب کرنے والوں میں سابق اٹارنی جنرل پاکستان حاجی غیاث محمد، تنظیم کے کنوینر جناب اسماعیل قریشی، سابق جج لاہور ہائی کورٹ سردار عبدالجبار خان، لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب عارف چودھری، میاں شیر عالم اور پرنسپل لاہور لا کالج سردار محمد اقبال موکل شامل تھے۔

یہ ایک علمی محفل تھی جس میں شریعت کے نفاذ سے متعلق فکر انگیز تقاریر کی گئیں۔ مقررین حضرات نے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے متعلق مختلف سوالات اُٹھائے اور اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ اس راہ پر پیش رفت کے لیے سیاسی، معاشرتی اور سماجی سطح پر کیا کیا اقدامات ہونے چاہئیں۔

عالمی تنظیم ماہرینِ قانون اسلامی کے کنوینر جناب محمد اسماعیل قریشی نے پہلے اس تنظیم کے اغراض و مقاصد بتائے۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے متعلق فکر انگیز باتیں کیں۔

جناب محمد اسماعیل قریشی نے کہا کہ پاکستان اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں پر اللہ کا قانون نافذ ہوگا، لیکن ماضی میں قائدِ اعظم کے بعد جتنے بھی حکمران آئے وہ خود معبود بن بیٹھے۔ اب برسوں بعد صدر ضیاء الحق نے شریعت بنچ آرڈر کا اعلان کر کے منزل کی جانب پہلا قدم اٹھایا ہے۔ یہ ایک ایسی مستحسن کوشش ہے جس پر ساری قوم مبارکباد کی مستحق ہے، البتہ ایک خاص گروہ، جو اسلام کے نام سے بدکتا ہے، شکوک و شبہات پھیلا رہا ہے۔ شریعت بنچ آرڈر کے بارے میں بعض اعتراضات بھی اٹھائے جا رہے ہیں مثلاً:

۱۔ یہ بنچ انتظامیہ کی گرفت سے آزاد ہو کر فیصلے کر سکے گا یا نہیں؟

۲۔ عائلی قوانین کو شریعت بنچ کے دائرۂ اختیار سے باہر کیوں رکھا گیا ہے؟

۳۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی بعض دفعات کے مطابق صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم قانون سے بالاتر ہیں۔ آئین میں ترمیم کر کے ان کو بھی شریعت کے تابع بنایا جائے، کیونکہ اسلامی معاشرے میں ہر فرد قانون کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ میاں شیر عالم نے کہا کہ قوم متعدد بار اسلامی جذبے کا مظاہرہ کر چکی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ختمِ نبوت اور نظامِ مصطفےٰ کی تحریکوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے عوام کو سب سے زیادہ عقیدت رسولِ کریم صلعم سے ہے اور وہ اس مُلک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

اب اسلامی نظام کے نفاذ کا عمل شروع ہوا ہے، تو قوم نے اطمینان محسوس کیا ہے۔ انہوں نے کہا حکمرانوں کو بھی اب اپنا طرزِ عمل بدلنا چاہیئے۔ ان کو لمبی لمبی کاریں چھوڑنا پڑیں گی۔ اسلامی مملکت کے سربراہ ایک خیمے میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ ہمیں یہ ایوانِ صدر نہیں چاہیئے۔

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب عارف چودھری نے کہا کہ اس وقت یہ غور کرنا چاہیئے کہ شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں من حیث القوم ہمیں کیا کرنا ہے۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، وہ تو پہلے سے موجود ہے۔ اسے لاگو کرنا بھی آسان ہے۔ اس میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیئے، لیکن یہ معاملہ اتنا سادا بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی وہ حالت نہیں جو نبی کریم صلعم اور خلفاء کے زمانے میں تھی؛ لہٰذا حکمرانوں کو اپنے قول و فعل کا جائزہ لینا چاہیئے اور عوام کی خواہشات کے مطابق اپنی اصلاح بھی کرنی چاہیئے۔ ہمیں

چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق مذاکرے سے خطاب کر رہے ہیں

اس پر غور کرنا ہوگا کہ قانون کی حکمرانی کے لیے قانون ساز اداروں اور انتظامیہ پر کیا بندشیں عائد ہونی چاہئیں۔

لاہور لاء کالج کے پرنسپل سردار محمد اقبال خان مؤکل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں جو شخص بھی اقتدار میں آیا، اس نے سب سے پہلے اسلام کی بات کی اور پھر سب سے پہلے اپنے عمل سے اسی کی نفی کی۔ بلاشبہ ہماری عدالتیں بہت اعلےٰ ہیں، اس کے باوجود جب بھی کوئی گھمبیر واقعہ پیش آتا ہے، سب لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس معاملے کو ملٹری کورٹ میں بھیجا جائے۔ جہاں ظلم کی انتہا ہوتی ہے۔ یہی مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ طریقۂ کار میں کون سی ایسی خامی ہے جس کی وجہ سے عوام اس قسم کے مطالبات کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پروسیجر کو شریعت بنچ کے دائرۂ اختیار سے باہر کیوں رکھا گیا ہے۔ کیا پروسیجر کو شریعت کے مطابق بنانے کی ضرورت نہیں؟ جب تک پروسیجر تبدیل نہ ہوگا، قانون کی حکمرانی نہ ہوگی۔

سردار محمد اقبال مؤکل نے کہا کہ ملک میں ایسے تحقیقی ادارے قائم ہونے چاہئیں جو قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں مددگار ثابت ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہم ہال کمروں میں تو مذاکرات کر رہے ہیں، لیکن باہر امیر غریب کے مابین زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔ اگر ہم صرف باتیں ہی کرتے چلے گئے، تو باہر کے حالات تیور بدل لیں گے۔ خدا کے لیے کہیں یہ ثابت نہ کر دیجیئے گا کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا حل نہیں۔

لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج سردار عبدالجبار خان نے کہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے انفرادی طرزِ عمل کو بھی تبدیل کریں۔ ایک طرف ہم مغربی طرز کی زندگی گذارتے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی نظام کے نفاذ کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ دو عملی ہمیں کہیں کا نہ رہنے دے گی۔

سابق اٹارنی جنرل حاجی غیاث محمد نے کہا کہ شریعت بنچوں کو غیر اسلامی قوانین کو منسوخ کرنے کا اختیار ملنا چاہیئے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس شیخ انوار الحق نے کہا کہ وہ اپنے رفقاء سے شریعت بنچ آرڈر کے بارے میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ پاکستان بار کونسل بھی اس ماہ کے آخر تک اپنی رپورٹ بھیج دے گی۔ اس کے بعد شریعت بنچوں کو آخری شکل دی جا سکے گی۔ چیف جسٹس نے وکلار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ نہ صرف پاکستان، بلکہ دنیا بھر کے مہذب ممالک میں وکلار نے انسانی اقدار کی سربلندی اور انسانیت کے وقار میں اضافے کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ پاکستان میں اس برادری نے جس طرح جدوجہد میں عملی حصہ لیا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

جناب شیخ انوار الحق نے کہا کہ ایک چیز توجہ طلب ہے کہ اکثر اسلامی ممالک میں اسلامی نظام مسخ ہو چکا ہے، کیونکہ ان پر صدیوں غلامی مسلط رہی۔ ہمارے ہاں بھی ڈیڑھ دو برس کی غلامی نے اسلامی روایات کو تبدیل کر کے رکھ دیا؛ لہٰذا اسلامی ممالک میں ان بیرونی اثرات اور اسلامی اقدار کے مابین کشمکش جاری ہے۔ اسلامی اقدار کے احیاء کے راستے میں بہت سی مشکلات حائل ہیں جو محض عملی نہیں؛ بلکہ نظری اور فکری ہیں۔ جس ماحول میں ہم رہ رہے ہیں، اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں چند امور توجہ طلب ہیں:

۱۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ قوم کا مطالبہ اور اضطراب جائز ہے، لیکن جن حضرات پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے، وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کر سکتے، جس سے ایک بہت بڑے شعبے میں خلار پیدا ہو جائے۔

۲۔ جہاں تک پروسیجر کا تعلق ہے، ہم نے اس کا جائزہ لیا ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان افراد میں ہے جو عدالتوں کو پریذائڈ کرتے ہیں یا پھر خرابی وکلار میں ہے جو اُن کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دیوانی کیس میں چالیس بار پیشی لی جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب تک ہم معاشرے کی اصلاح نہ کریں، انسان کے دل میں خوفِ خدا پیدا نہ کریں گے، تبدیلی نہ آئے گی۔

۳۔ صدرِ پاکستان کو کسی نے مشورہ دیا کہ دیوانی مقدمات نبٹانے کے لیے فوجی افسر تعینات کئے جائیں۔ انہوں نے مجھ سے بات کی۔ مَیں نے کہا کہ اس سے مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ہم نے ایک کمیٹی بنا کر دیوانی عدالتوں کے طریقۂ کار کا جائزہ لیا، تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ اس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے۔

۴۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کو دور کیسے کیا جا سکے؟ سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مقصد کی طرف لوٹنا ہوگا، جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک عملی قدم شریعت بنچ آرڈر کی صورت میں اٹھایا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ناکافی ہے، لیکن ہمیں اس کو مختلف انداز میں دیکھنا چاہیئے۔ اسلامی معاشرے میں حکومت پر فرض ہے کہ وہ اسلامی اقدار کا نفاذ کرے، لیکن ۳۱ برس میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس آرڈر سے حکمرانوں پر ایک دباؤ ہے کہ وہ قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں جو عمل شروع ہو چکا ہے، اسے تیز کرنے میں بنچ اہم کردار ادا کرے گا۔

۵۔ بہت سے حضرات یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہوئے، تو لوگ اسلام سے مایوس ہو جائیں گے۔ یہ ایمان دار لوگ ہیں اور معاشرے کی حالت دیکھ کر ایسا سوچتے ہیں۔ پھر معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں بھی اختلاف موجود ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمل معاشی نظام سے شروع ہونا چاہیئے۔ کچھ کے خیال میں فواحشات پہلے ختم ہوں۔ میرے خیال میں اصلاح کا عمل تمام دائروں میں بیک وقت شروع ہونا چاہیئے، چونکہ قانون زندگی کے تمام دائروں پر محیط نہیں؛ لہٰذا سماجی اور اخلاقی سطح پر تبدیلی لانا پڑیگی۔

۶۔ ہمارے معاشرے میں تضادات موجود ہیں۔ ایک آدمی مال روڈ پر اسلامی قانون کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن دکان پر بیٹھ کر کم تولتا ہے۔ اس صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہونا چاہیئے جو ہر گلی محلے میں سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر اصلاح کا کام کرے۔

۷۔ میرے خیال میں آج سب سے زیادہ ضرورت اجتہاد کی ہے۔ مَیں یہ کہوں گا کہ اسلام کی سربلندی اور شریعت کے نفاذ کی خاطر جہاد اور اجتہاد دونوں چیزوں کو مدِنظر رکھیں۔

●●

عمدہ کوالٹی، اعلےٰ کام —— کیبلز کی دنیا میں عظیم نام ——
عظمت کیبلز
◐ پاکستان بھر میں مقبولِ عام
◐ ہر جگہ دستیاب
◐ پائیداری اور اعلیٰ کارکردگی کے لیے عظمت کیبلز کا نام یاد رکھیں۔
PLEASE SEE THIS LABLE IS UNBROKEN
P.V.C P.V.C
AZMAT CABLE - PAKISTAN
عظمت کیبلز (لاہور) پاکستان

آغا اشرف

رب، روٹی، لوک راج

شجرِ سیاست سے ایک اور شاخ پھوٹی

پاکستان مساوات پارٹی کے اساسی قومی کنونشن کے ساتھ ایک نئی سیاسی جماعت نے جنم لیا ہے۔

سیاسی نومولود کا نام پاکستان مساوات پارٹی ہے ——

جس کے بانی محمد حنیف رامے کو اس کا صدر اور بلوچستان کے ملک محمد انور کانسی کو نائب صدر نامزد کیا گیا ہے۔ کنونشن کے پہلے اجلاس میں ملک کی موجودہ سیاسی صورت پر ایک مبسوط قرارداد منظور کی گئی۔

محمد حنیف رامے کی دعوت پر دو ہزار سے زیادہ حاضرین نے کھڑے ہو کر ان کے پیچھے خدا کے حضور ایک عہد نامہ دہرایا جس میں کہا گیا کہ ہمارا عہد ہے کہ سرزمین وطن میں وہ معاشرت برپا کریں گے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیاں رواں دواں ہوں جو بیک وقت آزادی اور مساوات کا گہوارہ ہو اور جہاں رب اور روٹی میں کوئی تضاد نہ ہو۔ پارٹی کا نشان پنجہ ہے، پورا ہاتھ۔

کنونشن کا اجتماع پرنس ہوٹل کے گراؤنڈ میں ہوا۔ پولیس نے سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے تک منٹگمری روڈ پر ٹریفک بند رکھی۔ کنونشن میں لاؤڈ سپیکر بھی استعمال کیا گیا۔ صبح کے اجلاس کے بعد ایک بجے دال روٹی اور نماز جمعہ کے لیے وقفہ ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کنونشن کے شرکاء کو دال روٹی پر بٹھا کر پارٹی کے بانی مبانی انٹر کان جا بیٹھے۔ مساوات کا ابتدائی مظاہرہ، کنونشن کے شرکاء کو دال روٹی اور خود انٹر کان میں مرغ کی بوٹی۔ کنونشن کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس میں ڈھول بجانے والے بھی بلائے گئے تھے اور جب کوئی مقرر جوش میں آکر تقریر کرتا تو ڈھول والا زبردست تھاپ کے ساتھ ڈھول بجاتا۔

اس نئی سیاسی پارٹی کی پیدائش پر ہفت روزہ صحافت کا رامے نمبر بھی نظر سے گزرا۔ رامے کی شخصیت اور اس کے سیاسی پس منظر کا ایڈیشن۔ سرورق پر رامے کی تصویر اور جلی حروف میں یہ جملہ :

"یہ شخص کیا چاہتا ہے ؟"

اس کے بارے میں ایک سوچ یہ ہے کہ یہ شخص کرسی چاہتا ہے۔ چھنے ہوئے اقتدار کے تعاقب میں ہے۔ اختیارات کی کٹی پتنگ پکڑنے کے لیے ہاتھ میں موقع شناسی کا بانس لیے بے یقینیوں کی ڈسی ہوئی پاکستانی سیاست کے کسی موڑ پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس ملک میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ لوگ سیاست دانوں سے بد دل ہو کر مداریوں اور مسخروں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ جنت دکھا کر جہنم میں لے جانے والے زعمائے ملت سے متنفر ہو گئے تھے۔ ایسے میں کچھ اتفاقی بُلبلے وقت کی سطح پر اُبھر آئے اور بھنور بن گئے۔ مسٹر بھٹو لیڈر بنے، سیاست دان بنے اور پھر سربراہ بن گئے، تو وہ بھی جو ان کے ساتھ چلے تھے، بہتی گنگا میں بہہ کر امر ہو گئے۔ وزارتوں اور صدارتوں کی کرسیاں مل گئیں۔ کسی نے بچہ سقہ کی طرح چند گھڑیوں کی بادشاہت کی کیسی کیسی حال بادشاہت کے مزے لوٹے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو شیڈول کے مطابق ایک کرسی سے اتار کر دوسری کرسی پر بٹھا دیے گئے اور کچھ وہ تھے جنہیں بڑے بادشاہ نے ناراض ہو کر بالکل ہی کرسی سے اتار دیا۔ خوش قسمت تھے، موت کے گھاٹ نہیں اتارے گئے۔

کرسی کی محبت بُرا حال کرتی ہے۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اقتدار کا نشہ اترنے کے بعد بڑا پریشان کرتا ہے۔ حنیف رامے بھی ان لوگوں کی طرح جن پر عتاب نازل ہوا اور کرسی سے اتارے گئے، کرسی سے جدا ہو کر ہجر و فراق کی اذیتوں کے ساتھ ساتھ جابر سلطان کے عذاب کی خونخوار دلدلوں سے گزرے اور اپنی مظلومیت کے پس منظر میں ان کی حکمرانی اور برطرفی کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دردناک ہے اور عبرتناک بھی۔

پیپلز پارٹی چھوڑنے کے بعد رامے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اسے چھوڑا تو سیاسی فری لانسری اختیار کر لی، لیکن دور کھڑے ہو کر سیاست کی شطرنج پر نظر رکھی کہ کس شاطر نے کس شاطر کو شہ دی یا مات دی۔ اس دوری میں کچھ ان کا اپنا بھی ارادہ تھا اور کچھ آپس میں گتھم گتھا سیاسی پارٹیوں کی لاپروائی اور سرد مہری بھی تھی کہ نہ تو کسی نے انہیں اپنی پارٹی میں ڈھالنے کے لیے شمولیت کی دعوت دی اور نہ انہیں خاطر میں لائے اور پھر وفاقی حکومت کے حاکموں کی قرعہ اندازی میں بھی ان کا نمبر اور نام نہ تھا؛ لہٰذا انہوں نے نمایاں رہنے اور کرسی کو دوبارہ پانے کی کوشش میں ایک پارٹی کو جنم دیا ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

اور ایک قیافہ یہ بھی ہے کہ سیاسی بلیک آؤٹ میں انہوں نے اپنے سیاسی مستقبل کے لیے خطرے کے سائرن سنے، تو کچھ خدشے کچھ کھٹکے دامن گیر ہوئے؛ لہٰذا انہوں نے مساوات پارٹی کی داغ بیل ڈال دی ؎

چراغ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

یہ سب ایسے چبھتے زاویے ہیں کہ جن پر قلم اٹھانا اور حقائق کو ریاضی کی زبان میں بیان کرنا بقول شخصے آسان نہیں۔ مختلف ذہنوں میں مختلف سوچیں ہیں۔ سیاست کے مختلف زائچے ہیں۔ قیافے ذہنوں سے زبانوں تک یوں بھی سفر کر رہے ہیں۔

ایک قیافہ یہ بھی ہے کہ رامے صاحب کی سیاست کے کولڈ سٹوریج میں ایک نہیں کئی زبانیں ہیں، جیسا موقع محل دیکھتے ہیں، ویسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ کنونشن میں خود ہی انہوں نے بھٹو کے نقائص نکالے اور اسی لمحے بھٹو کے سیاسی کارنامے گنوانے لگے، یہ اُن کی زود فراموشی ہے۔

رامے نے کہا کہ بھٹو نے ملک بھر کے عوام کو سیاسی شعور بخشا، جبکہ بھٹو کے بارے میں ایک سنجیدہ گروہ کی یہ رائے ہے کہ ان میں ذرا بھی سیاسی شعور نہیں۔ سیاسی بے شعور رہے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی چند سالہ ہے اور ان کی سیاست نے جو آندھی اٹھائی ہے، اس میں ملکی سالمیت کے تنکے ابھی تک یوں منتشر ہو رہے ہیں کہ انہیں یکجا کرنا محال ہو رہا ہے۔ ان کی انتشار کی سیاست نے اہل سیاست کے مزاج کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے دورِ اقتدار میں جرائم پیشہ لوگ معاشرے میں کھل کھیلنے لگے۔ شریفوں کی شرافت کو غنڈوں نے بھرے بازاروں میں گھسیٹا، دانہ ڈال کر آجر و مزدور کو لڑایا۔ سرمایہ دار اور غریب میں نفرت کی کھائیاں کھودیں۔ کہیں آگ لگائی کہیں بجھائی۔ پوری قوم کو اسلام سے گمراہ کر کے بھٹو ازم میں سمونا چاہا۔ ان کی جادوگر سیاست نے لکڑی کی تلوار سے گردنیں کاٹیں —— اور اس کا اقرار رامے نے خود اپنی تقریر میں بھٹو صاحب پر تنقید کرتے ہوئے بھی کیا کہ سابق وزیر اعظم نے بائیس خاندانوں کا نام لے کر آٹا پیسنے کی چکیاں بھی سرکاری تحویل میں لے لیں۔ صنعتیں جامد ہو گئیں، روزگار کا دائرہ سکڑ گیا۔ لوگوں نے روزگار مانگا، تو ان کو پاسپورٹ تھما کر ملک بدر کیا۔ باہر سے کاغذی نوٹ آنے لگے۔ پیداوار میں کمی اور دولت کی فراوانی سے مہنگائی پیدا ہوئی جو اب ملک کے

غریب عوام کا خون چوس رہی ہے۔ ملک کا خون چوسنے والی سیاست کو جنم دینا اگر سیاسی کارنامہ ہے، تو سیاسی سیہ کاری کیا ہے؟ اگر یہ سیاسی شعور ہے، تو پھر سیاسی بے شعوری کس کا نام ہے؟

رائے صاحب کے اپنے الفاظ نے خود ان کے سیاسی شعور کے بارے میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں۔ پاکستان مساوات پارٹی نے کیا اسی شعور سے جنم لیا ہے؟ یہ انقلابی پارٹی جس انقلاب کو لانے کے لیے آئی ہے، کیا وہ ذہنوں میں اسی سیاسی شعور کے بوٹے لگائے گا؟ اور پھر وہ بوٹے پروان چڑھ کر کس رنگ کے پھول اور کس ذائقے کے پھل پیدا کریں گے؟

اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اب تک جتنی بھی سیاسی پارٹیاں یہاں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ انقلابی منشور اور کایا پلٹ مقاصد لے کر ہی آئی ہیں۔ ان کے انقلاب پر اسلامی انقلاب کی چھاپ ہی نظر آتی ہے۔ لوک راج کے نعرے ہی لگاتی آئی ہیں، لیکن جب وقت نے پردہ اٹھایا، تو نظر آیا کہ ان میں سے کئی سیاسی پارٹیوں کے ختنے بھی نہ ہوئے تھے، بس پیشانی پر پوسٹر اسلام کا لگا رکھا تھا۔ ان پارٹیوں کے مضمرات کی پرتیں کھلیں، تو قوم کو پسینے آ گئے۔ لوگوں کو راج کرانے کے بجائے انہوں نے لوگوں پر فرعون بن کر راج کیا۔ روٹی، کپڑے، مکان کے جھانسے دیے اور بھوکوں کے منہ سے لقمہ بھی نکال لیا۔ کپڑے تو درکنار ان کا کفن بھی اتار لیا۔ گھر تو بڑی بات ہے، غریب ان کی حکمرانی میں ڈربہ بھی نہ بنا سکا اور اگر کسی کا گھر تھا بھی تو اسے بے گھر بنا دیا گیا۔ یہ سب کوائف تازہ تاریخ کا حصہ ہیں جن کی بنیاد وہ حقائق ہیں جن کو وہی شخص جھٹلا سکتا ہے جو سچ کے مفہوم سے ناآشنا ہو یا جھوٹ بولنے میں خدا کے خوف سے نہ ڈرتا ہو۔

لوگ سیاست سے بیزار ہو چکے ہیں، سیاست دانوں سے بیزار ہو چکے ہیں۔ مزید سیاسی جماعتوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہے۔ رائے صاحب اگر دل میں ملک اور قوم کا درد رکھتے ہیں، تو کوئی ایسی پارٹی بنائیں جو تخریبی سیاست اور کھوکھلے سیاست دانوں کا پوسٹ مارٹم کرے۔ قوم کو اس وقت سیاست گری نہیں چارہ گری چاہیئے۔ رائے صاحب دکھیا انسانوں کے چارہ گر بنیں۔ چھن جانے والی کرسی کے پیچھے نہ بھاگیں، قوم کے دل میں گھر بنائیں۔

اور ایک آواز یہ بھی ہے کہ رائے صاحب نے اپنی تقریر میں صوبائی خود مختاری، آئینی، جمہوری حکومت اور دستور وغیرہ کے سیاسی الفاظ کو سیاسی تکنیک کے سنہری ورق میں لپیٹ کر جس انداز سے پیش کیا ہے، وہ بھٹو صاحب کے چار قومیتی شوشے ہی کی شکل ہے۔ اس آئینی و جمہوری کیپسول کے باہر امرت کا لیبل ہے اور اندر اس کے علاقائی و صوبائی عصبیت کا زہر اور یہ دستور رائے صاحب نے اس لیے اپنایا ہے کہ بلوچستان اور سندھ کے عوام میں اپنی خات کی خوش فہمی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے بارے میں مزید بدگمانی پیدا کر کے جماعتی نفری بڑھائیں۔ اپنا سیاسی کرم پورا کریں اور پاکستان کی سالمیت پر تفرقہ بازی کے نشتر چلوائیں۔ یہ سب کچھ اس لیے زبان سے اگلا جا رہا ہے کہ ان کی آواز بھی اپنی آواز میں شامل ہو جائے، آگے بڑھنے کا اک بہانہ۔

اور یوں زبانیں بھی کھل رہی ہیں کہ قربانی دینا آسان نہیں۔ یہ تو وقت بتلاتا ہے کہ کون اپنی قربانی دیتا ہے اور کون دوسروں کو قربانی کا بکرا بناتا ہے۔ چور دروازوں سے اندر آنے والوں کی تعداد بھٹو کے عہد میں زیادہ تھی۔ پیپلز پارٹی کا ہر دروازہ چور دروازہ تھا۔ رہا مرکز میں بقول رائے غیر نمائندہ سیاسی حکومت کو ختم کرنے کا سوال، تو یہ غیر نمائندہ حکومت نہیں جو وزراء وفاق میں اس وقت کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے ناطے عوام کے نمائندے ہیں، پھر ملکی سالمیت کے تحفظ کے پیشِ نظر یہ ضروری نہیں کہ سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہی لیے جائیں اور وہ باضابطہ منتخب ہوں۔ اگر ملکی آزادی اور بقا کو خطرہ لاحق ہو اور سیاسی دھڑے ذاتی منفعت کی بنا پر "جہاں ہم نہیں سحر نہیں" کے زعم میں عدم تعاون کا اظہار کریں، سیاسی عشوے غمزے دکھائیں، تو ان کو نظر انداز کر دینے ہی میں ملک و ملت کا فائدہ ہے۔ ان لوگوں کے بجائے ایسے لوگوں کو ملک و ملت کے اس کام میں شامل کر لینا چاہیئے جو ملکی استحکام کی خاطر رضاکارانہ طور پر تعاون کریں۔ بے داغ سیرت و کردار کے حامل ہوں۔ دل میں ملک اور قوم کا درد رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو ساتھ لے کر حکومت بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسی صورت میں انتخابات ضروری نہیں، خود وضع کردہ فارمولے ہی ضروری ہیں۔

سیاست دانوں کے کورے جواب پر جنرل ضیاء الحق کا ردِ عمل یہ تھا کہ چلیے اگر سیاست دان شریکِ اقتدار نہیں ہوتے تو مارشل لا ہی سہی

دجال کو رب ماننے والوں
کو روٹی ملے گی

ملک کو بچانا ہے، قوم کو مٹنے نہیں دینا۔ میں خود ہی زندگی کے مختلف شعبوں سے اپنی دانست کے مطابق اہل وزراء نامزد کر کے حکومت مرتب کر لوں گا اور دیکھوں گا کہ عام انتخابات کے لیے موزوں لمحات کتنے برسوں میں جنم لیتے ہیں اور یہ عین اسلامی رویّہ ہے۔ حضرت عمر فاروق نے حضرت خالد سیف اللہ ایسی شخصیت کو معزول کر کے کسی مصلحت کی بنا پر سپاہِ اسلام کی قیادت جسے مناسب سمجھا اُسے دے دی جبکہ کردار کے اس غازی سے کوئی غلطی بھی سرزد نہ ہوئی تھی۔ اسلامی مملکت میں سربراہ کو یہ اختیار رہے اور اس کی طرف سے نامزد کیا گیا کوئی اور شخص بھی مصلحت کی بناء پر ایسا کرنے کا مجاز ہے۔

اور ایک لہجہ یہ بھی ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین ملکی و ملی مفاد میں جب بھی ضرورت محسوس ہو بدلا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی قرآن کریم کی آیت نہیں جس میں تنسیخ و ترمیم کا مرتکب ہونا تحریف کا مرتکب ہونا ہے۔ ملکی ضرورت کے مطابق اس میں ہر تبدیلی کی جا سکتی ہے، چاہے وہ ملک کے ایوانِ اعلیٰ کے اراکین کی ایک بہت بڑی اکثریت ہی نے کیوں نہ وضع کیا ہو۔ ملکی مصلحت کی بناء پر سربراہِ سلطنت اسے بدلنے کا مجاز ہے۔ پہلے ملک ہے آئین اس کے بعد ہے۔ ملک نہ رہا تو آئین کہاں رہ جائے گا۔ ہر وہ اقدام جو ملکی سلامتی کے لیے اپنایا جائے، آئین ہے۔ کسی ذاتی غرض و غایت کی آڑ میں آئین آئین کی رٹ لگانے والے پہلے ملک کی سلامتی کی بات کریں۔ ملکی بقا و استحکام کے مقابلے میں انتخابات کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں کہ اٹھتے بیٹھتے انتخاب انتخاب کا ورد کیا جائے۔ کرسی کے دیوانوں اور اقتدار کے بھوکوں کے لیے انتخاب جلدی ہو گا، مارشل لا کے لیے نہیں۔ جب تک تمام فضا سازگار نہیں، ماحول مناسب نہیں، جب تک ملک دشمن عناصر اور گندم نما جو فروشوں کا احتساب نہ ہو جائے، انتخاب ضروری نہیں۔

اور ایک آواز یہ بھی ہے کہ جب تک ماحول سازگار نہ ہو جائے، فوج بیرکوں میں نہیں جا سکتی۔ فوج فقط چھاؤنیوں میں پریڈ کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ فوج کا کام ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہی نہیں، بلکہ اندرونی خطرات سے بھی ملک کو بچانا ہے اور یہ اس کا آئینی فرض ہے۔ اگر فوج اس سے غفلت کرتی ہے، تو یہ اس کی مجرمانہ غفلت ہے۔ فوج کو اس کے فرض کی ادائیگی سے پہلے بیرکوں میں بھیجنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو جیسے بھی ہو جلدی سے کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، پاکستان میں خانہ جنگی کرا کر اسے بیروت بنانا چاہتے ہیں۔

اور ایک تھنکنگ یہ بھی ہے کہ رائے نے کہا کہ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد جاگیر داران کی کرسی پر مسلط ہو گئے تھے اور مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء کے انقلابی منشور کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جب سرمایہ داری اور آمریت کے مکروہ اتحاد کے خلاف بھٹو سر پر کفن باندھ کر نکلا، تو ہم بھی اس کے ساتھ نکلے۔ آج جو لوگ چور دروازے سے اقتدار میں آئے ہیں پیپلز پارٹی نے ان کی ضمانتیں ۱۹۷۰ء میں ضبط کرا دی تھیں۔

اور وہ اس لیے کہ مسلم لیگ نے اپنا منشور بالائے طاق رکھ دیا تھا جو پارس سمجھے جا رہے تھے، پتھر نکلے۔ لوگ ان سے بیزار ہو گئے۔ مسلم لیگ سے ان کا جی بھر گیا، لیکن ایک فریب سے نکل کر دوسرے فریب میں پھنس گئے۔ بھٹو سر پر کفن باندھ کر نہیں سازشوں کا خوشنما قالین سر پر رکھ کر نکلا تھا اور اس کی بغل میں معاہدۂ تاشقند کا پٹارہ تھا، لوگ اس سسپنس میں رہے کہ دیکھیں کیا نکالتا ہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ فریب کا پٹارہ ہمیشہ خالی ہوتا ہے۔

اور ایک بتاوَنی یہ ہے کہ کنونشن میں ڈھول ڈھمکے کو دیکھ کر بھٹو کے ڈھول ڈھمکے یاد آ گئے۔ بھٹو کے ہر جلوس ہر جلسے میں ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتے ہوئے بھٹو کے نعرے لگانے والے بھٹو کے عوام، پالتو پٹھو، کرائے کے لوگ، کرائے کے قاتل، کرائے کے کارکن۔ رائے صاحب نے اپنے سیاسی پیشوا کی پالیسی اپناتے ہوئے پیش رفت کی ہے، البتہ رب اور روٹی کا چکر سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ رب اور روٹی کا کیا بُعد ہے۔

اس ضمن میں ایک کہاوت بڑی مشہور ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، مہا کال پڑ جائے گا، لوگ بھوک کے مریں گے، دجال آئے گا جو گدھے پر سوار ہو گا اور ڈھیر سی روٹیاں بھی اس نے گدھے پر سوار کر رکھی ہوں گی۔ بھوکے لوگوں سے کہے گا کہ جو کوئی اس کو رب کہے گا، اس بھوکے کو وہ روٹی دے گا۔ خدا خبر یہ کہاوت ٹھیک ہے یا غلط، لیکن رائے صاحب کی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ یہاں کرسی کی بھوک ہے، اقتدار کی بھوک ہے، روٹی کی بھوک ہے، جنسی بھوک ہے، ہر طرف بھوک ہی بھوک ہے۔ رب بھوکوں کو روٹی دے تاکہ وہ روٹی کھائیں، پاکستان کو نہ کھائیں۔

●●

فدا احمد کاردار

بدبودار ماحول میں خوشبودار موسیقی

بھارت اور پاکستان کی فلمی دنیا میں

زمین آسمان کا فرق ہے۔

ایک شام پاکستان کے مشہور گلوکار مہدی حسن سنا رہے تھے :

"میں بھارت کے نامور موسیقار لکشمی کانت پیارے لال سے ملنے ان کے گھر گیا۔ فلیٹ میں داخل ہوا، تو جو صاحب میری رہنمائی کر رہے تھے، انہوں نے ایک کمرے سے باہر جوتے اتار دیئے۔ مجھے اپنے رہبر کی پیروی کرنی پڑی۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک کمرے سے گزرے پھر دوسرے سے گزر کر تیسرے کمرے میں پہنچے، تو وہاں ایک کمرے میں قالین بچھے ہیں اور ہارمونیم موجود ہے۔ میں کمرے کی نفاست، صفائی، خوشبو میں بسی فضا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور حیرانی بھی ہوئی میرے خیال میں وہ ایک ایسا کمرہ تھا، جس کے اندر بیٹھ کر موسیقار بڑی یکسوئی سے جس معیار کی دھن چاہیے، تخلیق کرے۔ وہ دھن نہ صرف بھارت کی فضاؤں میں جادو بکھیرے گی، بلکہ اس کا اثر پوری دنیا میں محسوس کیا جائے گا۔"

آج زندگی کے قارئین کو اس ماحول کی تصویر دکھانے کی کوشش کرتا ہوں، جس بوجھل، بدبودار اور گھٹے گھٹے ماحول میں پاکستان کی فلمی دنیا کے نامور موسیقار گیتوں کی تخلیق کرتے ہیں۔

یہ ایورنیو سٹوڈیو میں ایک فلمساز کا دفتر ہے۔ یہ دفتر دو کمروں ایک باتھ روم اور ایک سٹور پر مشتمل ہے۔ اس سٹور میں وہ کپڑے رکھے جاتے ہیں جنہیں اداکار فلموں کی شوٹنگ کے وقت پہنتے ہیں۔ عام طور پر یہ کپڑے تھوک کے بھاؤ لنڈا بازار سے خریدے جاتے ہیں اور ان میں اتنی بدبو جمع ہوتی ہے کہ جہاں یہ کپڑے سٹور کئے جاتے ہیں وہاں بدبو کی وجہ سے ایک لمحہ گزارنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس سٹور سے ملحقہ باتھ روم ہے جس کا فلش اکثر خراب رہتا ہے اور مسلسل صفائی نہ ہونے کی وجہ سے اس باتھ روم پر بھی بدبو کی حکمرانی ہوتی ہے۔ قارئین کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ باتھ روم اور سٹور کی بدبو ماحول پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہوگی۔ اکثر ہمارے موسیقاروں کو سٹوڈیوز کے ایسے ہی گھٹے گھٹے اور بدبودار ماحول سے سمجھوتہ کر کے ان گیتوں کی دھنیں تیار کرنی پڑتی ہیں جو گیت ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے کے بعد سامعین کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

کمال احمد کا شمار پاکستان کے ان موسیقاروں میں ہوتا ہے، جن کی تخلیق کی ہوئی دھنوں پر گائے ہوئے گیت عوام اور خواص میں خاصے قبول ہوئے ہیں۔ میں ایورنیو سٹوڈیو کے برآمدے میں جا رہا ہوں، چند گانے والی خواتین برآمدے میں بیٹھی ہیں۔ ان کی زبانی پتہ چلتا ہے :

"کمال احمد دفتر میں بیٹھے گیت کی دھنیں بنا رہے ہیں۔ فارغ ہوتے ہیں، تو ریہرسل ہوگی۔"

میں فلمساز کے دفتر میں گھستا ہوں، تو کمال احمد کا اسسٹنٹ ہارمونیم اٹھائے کھڑا ہے اور فلمساز کمال احمد سے کہہ رہا ہے :

"آپ سٹور میں جا کر اپنا کام کریں۔ اب ہم دفتر میں کام کریں گے۔"

اور فلمساز کے ساتھ کام میں حصہ لینے کے لئے تین چار ایکسٹرا لڑکیاں بھی ہیں۔ میں بھی کمال احمد کے ساتھ سٹور میں داخل ہوتا ہوں، تو بدبو کا ایک خطرناک قسم کا بھبوکا مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے؛ لہٰذا میں بدبو سے نجات پانے کے لئے ناک پر رومال رکھ لیتا ہوں، لیکن کمال احمد نے کسی قسم کا ردعمل قبول نہیں کیا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے بدبو اور کمال احمد کی پرانی دوستی ہے۔

میں لکشمی کانت پیارے لال کے بارے کچھ نہیں جانتا تھا، حد یہ ہے کہ جب مہدی حسن نے اس سے غائبانہ تعارف کرایا تھا، تو میں اس کا نام بھی بھول گیا تھا، پھر جب یہ مضمون لکھنے کی نوبت آئی، تو مجھے اس کے نام کی تصدیق کرنے کے لئے اپنے دوست گیت نگار کلیم عثمانی سے مدد لی۔ لکشمی کانت پیارے لال کے مقابلے میں اپنے ملک کے موسیقار کمال احمد سے خوب واقف ہوں۔ اس کی صلاحیتوں اور مصروفیتوں سے بھی واقف ہوں۔ اس سال پاکستان میں سب سے زیادہ مقبول ہونے والے گیت کی دھن کمال احمد نے بنائی تھی۔ بول تھے:

تیرے میرے پیار کا ایسا ناطہ ہے۔

اس گیت کے علاوہ سنگیتا کی فلم عشق عشق اور زینت بیگم کی فلم آبشار کا موسیقار بھی یہی کمال احمد تھا۔

میں کمال احمد سے پوچھتا ہوں۔

آپ موسیقار ہیں یا مستری۔

شاید اسے مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی، وہ چونک کر مجھ سے پوچھتا ہے۔

میں اسے وہ واقعہ سناتا ہوں جب مجھے مہدی حسن نے سنایا تھا اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کیونکہ مجھے مہدی حسن کی زبان سے وہ واقعہ سن کر یہ محسوس ہوا تھا کہ بھارت کے فلمساز اپنے ملک کے موسیقار کو انجنیئر سمجھتے ہیں، جب کہ ہمارے ملک کے فلمسازوں نے پاکستان کے موسیقاروں کو ہمیشہ مستری سمجھ کر ان کے ساتھ سلوک کیا ہے۔

مجھے اکثر سٹوڈیوز میں یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ فلمسازوں کے کارندے کبھی گیت نگار تسلیم فاضلی کی تلاش میں ہوتے ہیں اور کبھی کمال احمد کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کہیں کوئی انہیں نظر آ جائے، تو اسے ایسے پکڑ لیتے ہیں جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔

کمال احمد بھی کہتا ہے۔

"جن حالات کا ذکر آپ نے کیا ہے، اگر ہم ان حالات میں گیتوں کی دھنیں بناتے ہیں اور وہ گیت پاکستانی عوام کے ہونٹوں پر گنگناہٹ بنتے ہیں، تو کیا یہ ہمارے فن اور ہماری صلاحیتوں کا کمال نہیں۔"

میں کمال احمد سے اتفاق کرتا اور پوچھتا ہوں۔

جس فلمساز نے آپ کو اپنے کمرے سے اٹھا کر یہاں بدبودار لنڈے بازار کے کپڑوں کے درمیان بھیجا ہے کیا وہ آپ کی اہمیت سے واقف نہیں یا وہ موسیقی کو اتنی سی فالتو چیز سمجھتا ہے کہ وہ آپ کو دھن بنانے کے لئے اچھا ماحول نہیں دے سکتا۔

وہ مجھے جواب دیتا ہے۔ میرے بھائی۔ اگر میری کوئی اہمیت ہے، تو ممکن ہے وہ آپ کی نظروں میں ہو۔ فلمساز تو ہمیں بالکل ویسے ہی ایکسٹرا سمجھتے ہیں، جیسے ہیرو یا ہیروئن کے ساتھ ہونٹ ہلاتے یا لبوں کو حرکت دینے والے فالتو لڑکے یا لڑکیاں سمجھتا ہے، ان کے خیال میں فلم کی موسیقی فالتو اور بے کار چیز ہے۔ اگر ہماری دھن پر بنا ہوا کوئی گیت ہٹ ہو گیا اور اس گانے کی وجہ سے فلم باکس آفس پر کامیاب ہو گئی، تو فلمساز اس کریڈٹ کا سہرا موسیقار کے سر نہیں باندھتا، بلکہ اس کا خیال ہوتا ہے کہ فلم کی کامیابی کا تعلق میرے مقدر اور قسمت سے ہے فلمی دنیا میں موسیقار یا موسیقی کی جتنی اہمیت ہے، اس کا مشاہدہ تو آپ لوگ ہر روز اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں اور آج آپ نے اس کی انتہا بھی دیکھ لی ہے اب وہ فلمساز جس نے مجھے اپنے دفتر سے اٹھا کر یہاں بھیجا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر کام نہیں کرے گا، بلکہ ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں کرے گا اور اپنا دل بہلائے گا۔

میرا سوال ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اس گندے اور بدبودار کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے سے انکار کر دیں اور اپنے گھر میں بیٹھ کر دھنیں تیار کریں۔

اس کا جواب ہے ۔

"نپولین کی لغت میں ناممکن کا لفظ نہیں تھا، مگر ہماری فلمی دُنیا کی لغت میں ناممکن کے لفظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارا کاروبار ایسا ہے کہ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے زیادہ وقت سٹوڈیوز میں فلمسازوں کی نگاہوں کے سامنے رہنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ تو اس روشنیوں کی دُنیا میں بھرتی کے کردار ہیں، فالتو اور بے کار کردار۔ اسی لیے کسی بھی لمحے فلمساز کو ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہمارا معاملہ تو اس محاورے جیسا ہے"

؎ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل

مَیں کمال احمد کو یاد دلاتا ہوں :

خواجہ خورشید انور بھی اس ملک کا موسیقار ہے، جس نے اپنی انا کی حفاظت کے لیے اپنی شخصیت کو فالتو اور بیکار شئے نہیں بنایا، وہ موسیقار تو پاکستان کا ایسا سرمایہ ہے جس کی عظمت کا اعتراف بھارت کے بڑے بڑے موسیقاروں نے بھی کیا ہے، جہاں موسیقی کو ہر گھر کی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔

کمال احمد میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے پُوچھتا ہے :

ذرا مجھے یہ تو بتائیے کبھی آپ نے خواجہ خورشید انور کو یہاں اسٹوڈیو میں دیکھا ہے۔ اُن پر تو اللہ کا کرم، اُن کے وسائل نے اُنہیں اپنی انا کی حفاظت کرنے کے قابل بنایا ہے، مگر کمال احمد اتنی جانبازی سے اپنی انا کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ غریب آدمی کے گھر پَیدا ہوا تھا۔ بچپن محرومیوں کے سائے میں گزارا۔ شعور کی آنکھ کھلی، تو اس نے اپنے آپ کو زندگی کی ناہموار راہوں پر بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتے دیکھا۔ اب یہاں تک آ پہنچا ہوں اور اپنے اُوپر اللہ تعالےٰ کا یہی احسان اور کرم سمجھتا ہوں کہ سُر سنگیت کے طفیل اپنے بچّوں کا پیٹ پال رہا ہوں۔

جس زمانے میں رنگیلا عروج کی طرف گامزن تھا، انہی دِنوں کمال احمد نے فلم کی دُنیا میں قدم رکھا اور آگے بڑھنے کے لیے جدّوجہد کا آغاز کیا۔ رنگیلے کے دن سیدھے تھے، مٹّی میں ہاتھ ڈالتا، تو سونا بن جاتی۔ پھر اس نے اپنے ماضی کی محرومیوں کا انتقام اس صورت میں لیا کہ پہلے وہ صرف فلموں کا اُیڈیل یا مسخرہ تھا، جب اس کی اپنی پروڈکشن کی فلم "دیا اور طوفان" نے باکس آفس پر مقبولیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا، تو وہ اپنے خول سے باہر نکلا اور اداکار کے علاوہ موسیقار، گلوکار، کہانی نویس، ہدایت کار، گیت نگار اور نہ جانے کیا کچھ بن بیٹھا۔ وہ فلم بھی ایک گانے :

؎ گا میرے منوا گاتا جا رے

کی وجہ سے سُپر ہِٹ ہو گئی تھی۔ اس گیت کی دُھن کمال احمد نے تیار کی تھی، لیکن اس گیت کا کریڈٹ رنگیلے نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ ان دنوں رنگیلا ہر وقت کمال احمد کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک دن موسیقار نے فلمساز اور ہدایت کار رنگیلا سے دس روپے مانگے، کیونکہ اس کے گھر آٹا نہیں تھا اور گھر پر اس کے بچے بھُوکے تھے۔ رنگیلا نے اسے دس روپے دینے سے انکار کر دیا اور اُسے لے کر انٹر کانٹی نینٹل چلا گیا۔ وہاں اُس نے رات دو بجے تک اسے ڈھائی تین سو روپے کی شراب پلا دی اور کمال احمد کی شخصیت شراب کے نشے میں ڈُوب گئی، مگر اسی وقت اس کا ضمیر بیدار ہو گیا جو اسے مسلسل ملامت کرتا رہا۔ رات کے آخری پہر میں کمال احمد نشے میں ڈُوبا ہُوا ڈگمگاتے قدموں سے ہوٹل سے نکل کر شاہراہ قائدِ اعظم پر آیا، تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کا ضمیر اس سے پُوچھ رہا تھا :

"تُو نے شراب پی کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کی، مگر تمہاری اس شراب نوشی سے بچّوں کا پیٹ تو نہیں بھرا اور انہوں نے ساری رات بھُوکے رہ کر گزاری ہو گی"

جب اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی، تو اُس کے کان صبح کی اذان کی آواز سُن رہے تھے۔

اس دن کے بعد پاکستان کی فلمی دُنیا کے اس باضمیر موسیقار نے صرف اپنے فن سے پیار کرنا شروع کر دیا اور یہ مقام پایا۔ اس وقت وہ فلمی دُنیا کے پروڈیوسروں کی ضرورت بنا ہوا ہے، مگر اتنی اہمیت حاصل کرنے کے باوجود فلمساز اُسے اپنے کمرے سے اُٹھا کر ٹاٹوں کی دھنیں بنانے کے لیے سٹور کا راستہ دکھاتے ہیں۔ جیسے ایکسٹرا لڑکیاں موسیقار سے زیادہ اہمیت رکھتی ہوں اور یہ سٹور ایسا ہے جہاں تاریکی بدبو اور گھٹن ہے۔ ایسی فضا اور ماحول میں تو سوچ کے سب خانے بند ہو جاتے ہیں۔

عوام میں پاکستانی نغموں کی مقبولیت کا ذکر ہوتا ہے، تو کمال احمد کہتا ہے :

ان گیتوں کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے ریڈیو ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، مگر ریڈیو کی پالیسی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

مثال کے طور پر اگر غالب کی کسی غزل میں "پیمانہ" کا لفظ ہے، تو ریڈیو والے اس غزل کو نشر کر دیتے ہیں، مگر ہمارے کسی فلمی گیت میں "پیمانہ" کا لفظ آ جائے، تو وہ گیت ریڈیو والوں کے خیال میں شجرِ ممنوعہ بن جاتا ہے۔ کیا ریڈیو والوں کی پالیسی ہمارے لیے المیہ سے کم ہے ؟ کہ ریڈیو کا سنسر کوڈ بنانے میں جن لوگوں کی تقرری ہوئی، اُن میں سے کوئی شاعری کی نزاکتوں اور ثقافتوں سے واقف نہیں۔ وہ فلم والوں اور دوسروں کے لیے الگ الگ پیمانے رکھتے ہیں۔

ابھی کمال احمد کی بات ادھوری ہے کہ اتنی دیر میں فلم ساز سٹور میں اس حالت میں داخل ہوتا ہے کہ اُس کے ناک پر رومال ہے، تاکہ سٹور کا بدبُودار ماحول اُس پر اثر انداز نہ ہو۔ وہ کمال احمد سے کہتا ہے :

باتیں نہ کرو، کام کرو ۔

اور کمال احمد کام کرنے کے لیے مجھے خدا حافظ کہتا ہے۔

●●

کراچی میں

گلف ہوٹل

صدر کے بارونق علاقہ میں

بالکل نیا اول درجہ کا

سنٹرلی ایرکنڈیشنڈ ہوٹل

اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی تمام سہولیات مثلاً جدید ترین لفٹ، پُرسکون کمرے جو بہترین آرام دہ فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ ہر کمرے میں ٹیلیفون ٹیلکس سروس۔ سواری کی سہولت ہر وقت مہیا رہتی ہے۔ اوّل درجے کا ایرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ۔ کشادہ لابی اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کی خدمت کے لیے مُستعد سٹاف۔ کرایہ انتہائی مناسب۔

gulf hotel

FRERE STREET SADAR
KARACHI
PAKISTAN

Telephones : 515831—39

(9 LINES)

اصلاحِ معاشرہ کی آٹھ قابلِ عمل تجاویز

ممتاز معاشرتی کارکن اور کالم نگار میاں عبدالرشید نے اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں ذیل کی تجاویز ایک تقریب میں پیش کیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اسے قارئین زندگی کی نذر کیا جا رہا ہے۔

آپ کی تشریف آوری میرے لئے باعثِ اعزاز و افتخار ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ مل بیٹھنا مفید نتائج کا حامل ہو اور ہم اپنے معاشرے سے ظلم و تعدی ختم کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔

مجلس کے طریقِ کار کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے اندر اس وقت جو شریف اور دلیر لوگ ہیں، ایسے لوگ جنہیں ظلم سے نفرت ہے، ان سے رابطہ قائم کرنا۔ دوسرے عوام کو احساس دلانا کہ وہ مجبور اور بے چارے نہیں، بلکہ بااختیار ہیں اور حکومت کی نوکر شاہی کو قانون کی پابندی پر مجبور کر سکتے ہیں۔

ظلم کے تدارک کے لئے میں چند تجاویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں، تاکہ ہم مل کر ان کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیں اور پھر انہیں قراردادوں کی صورت میں عوام اور حکومت کے سامنے پیش کریں۔

ہم نے جو کام کرنا ہے اسی ملک کے اندر کرنا ہے، اسی لئے پاکستان کے استحکام کو اوّلیت حاصل ہونی چاہیئے۔ میری پہلی تجویز یہ ہے:

۱۔ (الف) اسلام اور نظریۂ پاکستان کے خلاف پراپیگنڈے کی سزا موت مقرر کی جائے اور اسے سختی کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اس میں کسی سردار یا عامی یا چھوٹے یا بڑے صوبے کے باشندے کی رو رعایت نہ کی جائے۔

وضاحت

اسلام روح ہے اور پاکستان اس کا بدن ہے۔ جو اس ملک کی روح یا بدن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، وہ غدّار ہے اور اسے وہی سزا ملنی چاہیئے جو غدّار کو دی جاتی ہے، جیسے ڈاکٹر سارے بدن کی سلامتی کے پیشِ نظر کسی ایک زہر آلود عضو کا آپریشن کر کے اسے کاٹ دیتے ہیں یا اللہ تعالےٰ ساری انسانیت کو بچانے کی خاطر برائی میں ڈوبی ہوئی قوموں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پورے ملک کو بچانے کی خاطر چند غدّاروں کو موت کی سزا دینا لازمی ہے۔

(ب) کلیدی اسامیوں یا اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر کسی ایسے شخص کی تعیّناتی ہرگز نہ کی جائے جس کی وفاداری اسلام یا نظریۂ پاکستان سے مشکوک ہو یا جو نماز روزے کا پابند نہ ہو نیز جو ایسے لوگ آج کل ان اسامیوں پر موجود ہیں انہیں فوراً برطرف کر دیا جائے۔

(ج) جو سرکاری ملازم، خواہ وہ اعلیٰ کلیدی عہدے پر ہو یا معمولی اسامی پر، شراب، جوا یا جنسی بے راہ روی کا عادی ہو اسے بھی فوراً برطرف کر دیا جائے۔

(۲) (الف) حکومت اور عوام ظلم کے خاتمے کے لئے پورا زور لگا دیں۔ سربراہِ حکومت، وزراء اور انتظامیہ کے چھوٹے بڑے عہدے دار اسے اپنا فرضِ منصبی قرار دیں۔ عوام کا نعرہ یہ ہونا چاہیئے کہ نہ ظلم کریں گے، نہ کرنے دیں گے۔ عوام ظالم کا ہاتھ پکڑیں۔ ظالموں کو اپنے ہاں عزت کا مقام نہ دیں، نہ انہیں اپنی معاشرتی تقریبوں میں بلائیں، بلکہ انہیں محسوس کرائیں کہ وہ قابلِ نفرت لوگ ہیں۔

(ب) ظلم کی سب سے بھیانک اور مکروہ ترین صورت شر کاروں کے اڈے ہیں۔ حکومت انہیں ختم کرنے کے لئے فوری اقدام کرے۔ اگر اس کام کے لئے فوجی جوانوں یا کمانڈوز کو استعمال کرنا پڑے، تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ عوام ٹیکس اس لئے ادا کرتے ہیں کہ حکومت ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرے جو حکومت بچّوں کا اغواء اور بین الاقوامی منڈیوں میں ان کی فروخت بند نہیں کرا سکتی، وہ ٹیکس وصول کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ ظلم کے یہ اڈے بیرونی دنیا میں پاکستان کے لئے سخت بدنامی اور ذلت کا سبب بن رہے ہیں۔

(ج) عوام سے استدعا ہے کہ جن حضرات کے پاس شر کاروں کے بے گار کیمپوں یا بچّے اغواء کرنے والے گروہوں کے بارے میں کوئی صحیح معلومات ہوں وہ مجلس ہٰذا کو بھیج دیں جن بدقسمت حضرات کے بچّے اغواء ہو چکے ہیں، وہ ان کے نام مع تصاویر و کوائف ارسال فرمائیں۔ اگر حکومت نے تین ماہ کے اندر اس بارے میں کوئی کارروائی نہ کی، تو مجلس قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سلسلے میں خود کارروائی کرے گی۔

(۳) ظلم کا سب سے بڑا آلہ ہماری موجودہ پولیس ہے۔ انگریزوں نے اس کی بھرتی اور تربیت اس انداز سے کی تھی کہ ان کے ذریعے عوام کو دبا سکیں اور دہشت زدہ کر سکیں۔ پولیس جس کا مقصد قانون کا نفاذ اور عوام کا تحفظ ہونا چاہیئے، اپنے آپ کو قانون سے بالا سمجھتی ہے۔ عوام کو تحفظ دینے کے بجائے اسے تنگ کرنا اس کی پالیسی بن چکی ہے۔ ہم اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ موجودہ پولیس کو ایک دم برطرف کر دیا جائے اور اس کے بجائے مندرجہ ذیل خطوط پر نئی پولیس بھرتی کی جائے۔

(الف) پولیس کانسٹیبل کم از کم انٹرمیڈیٹ پاس ہو۔ اس کا قد چھ فٹ ہو۔ نماز روزے کا پابند ہو۔ ابتدائی تنخواہ کم از کم چھ صد روپے ہو۔ اسے رہائش کی سہولتیں بھی حاصل ہوں۔ اس کے پاس اعلےٰ درجے کے ہتھیار اور موٹر سائیکل ہو۔ اسے جوڈو کراٹے کی تربیت بھی دی جائے۔ پولیس کی نفری تھوڑی ہو، لیکن کارکردگی کا معیار اعلےٰ ہو۔

(ب) پولیس کی امداد کے لئے عوام میں سے اعلیٰ کردار اور اچھی صحت کے لوگ جن کی عمر تیس اور ۵۰ سال کے درمیان ہو معقول الاؤنس پر جز وقتی پولیس میں بھرتی کئے جائیں جو اپنے کام کاج اور فرصت کے اوقات میں امن دشمن عناصر پر کڑی نظر رکھیں۔

(ج) انتظامی اور تفتیشی پولیس الگ الگ کر دی جائے۔

(د) پولیس کی صوبائی تنظیم توڑ کر اسے ضلع وار یونٹوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(س) بڑے بڑے شہروں کی پولیس کے الگ الگ یونٹ ہوں۔

(س) جس علاقے میں جرم ہو اگر اس علاقے کا تھانے دار تین دنوں کے اندر مجرم کا سراغ نہ لگا سکے، تو اسے اسی جرم میں پکڑا جائے۔

(۴) ظلم کو دور کرنے کے لئے عدالتوں کا نظام بھی فوری طور پر بدلنے کی ضرورت ہے۔ پولیس کی طرح عدلیہ کی بھی از سرِ نو تنظیم کی جائے، کیونکہ انصاف میں تاخیر، انصاف سے محرومی کے مترادف ہے۔

ہم اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں:

(الف) جو مجسٹریٹ پانچ نماز روزے کا پابند نہیں اسے فوراً

برطرف کردیا جائے۔

(ب) قاضی یا مجسٹریٹ جرم ــــــ کی جگہ پر پہنچے اور قریبی مسجد میں اپنی عدالت لگائے، تاکہ گواہ اپنے محلّے کے لوگوں کے سامنے قسم کھا کر مسجد کے اندر گواہی دیں۔ اس طرح جھوٹی گواہی کے امکانات بہت کم رہ جائیں گے۔ فیصلہ موقع پر سنا دیا جائے اور وہیں محلّے کے سامنے سزا دی جائے۔ اپیل در اپیل کا چکر ختم کیا جائے۔

(ج) سزائیں قصاص، خون بہا، قطع ید، سنگساری، کوڑوں اور جرمانوں پر مشتمل ہوں۔

(د) قید کی سزا منسوخ کر دی جائے۔ ہر قیدی پر جتنا خرچ ہوتا ہے وہ گویا عوام کو جُرمانہ ہے۔ ہمارے قید خانے جرائم کے جراثیم پالنے کے فارم بن چکے ہیں، جہاں سے قیدی پکے مجرم بن کر نکلتے ہیں۔

قید خانے ختم کر کے کئی کروڑ سالانہ کے بے جا اخراجات بچائے جا سکتے ہیں۔ نابالغ بچّوں کو کسی صورت میں قید کی سزا نہ دی جائے۔ قید خانوں میں ان کے ساتھ بہت بھیانک سلوک ہوتا ہے۔

۵۔ ظلم کا ایک بڑا سبب ہمارے وکلا ہیں۔ ان میں سے بیشتر مجرموں کی پشت پناہی کر کے جرائم کو فروغ دے رہے ہیں، بلکہ اب تو بعض وکلا مجرموں کو جرائم کے ارتکاب سے پہلے مشورے دیتے ہیں اور اس کی فیس وصول کرتے ہیں۔ وکلا کو صرف بے گناہوں کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ان کا فرض ہے۔ انہیں مجرموں کو جرائم کرنے اور گواہوں کو جھوٹی گواہی کا سبق نہیں دینا چاہیئے۔ قانون میں ایسی تبدیلی کرنی چاہیئے کہ جب کسی ملزم پر جرم ثابت ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کے وکیل کو بھی اعانتِ جرم کی پاداش میں سزا دی جا سکے۔ بار کونسلوں کا فرض ہے کہ جو وکیل جرائم کے ارتکاب کے "قانونی" طریقے سمجھاتے ہیں، ان کے خلاف پیشہ وارانہ بدچلنی کے مقدمات قائم کریں۔

۶۔ جرائم کا ایک اور بڑا سبب فحاشی ہے۔ قرآنِ پاک کا حکم ہے کہ عورتیں بلا ضرورت گھروں سے نہ نکلیں، نہ اپنی زینت کی نمائش کرتی پھریں۔ اپنے سر اور سینے ڈھانپ کے رکھیں۔ دیندار اور سمجھدار خواتین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ان باتوں کی تبلیغ کریں اور خواتین کو سمجھائیں کہ ان کا اصل زیور حیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے سے معاشرے کی آدھی بُرائی ختم ہو سکتی ہے۔

(ب) اشتہارات میں عورتوں کی عُریاں تصاویر دینا ممنوع قرار دیا جائے۔

(ج) فحش لٹریچر اور فحش فلمیں بند کرنے میں سختی کی جائے۔ یہ جو گلی گلی فحش لٹریچر کی لائبریریاں کھُلی ہوئی ہیں اور بچّوں کے ذہنوں کو زہر آلود کر رہی ہیں، ان کے مالکوں پر اخلاقی دباؤ ڈال کر انہیں اچھی کتابیں رکھنے پر مجبور کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور فحش لٹریچر ضبط کر لیا جائے۔

۷۔ رشوت کا مؤثر علاج یہ ہے کہ عوام کو ہر اُس سرکاری ملازم کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی اجازت ہو جس کے رہن سہن کے اخراجات اس کی آمدنی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

۸۔ (الف) اخلاقی جرائم میں سزا یافتہ اشخاص اور بستہ (الف) اور (ب) کے بدمعاشوں کے نام ووٹروں کی فہرست سے خارج کر دیئے جائیں۔

(ب) ووٹر کی عمر کم از کم ۲۵ برس مقرر کی جائے۔

معاشرے کے اصل جرائم تین ہیں:

ظلم، رشوت اور فحاشی۔

ان کو ختم کرنے کے لیے عوام اور حکومت دونوں کو زور لگانا چاہیئے۔ جب تک عوام کی عزّت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہو، ان کے روزمرہ کے کام بغیر کسی رکاوٹ کے بخوبی سرانجام نہ پائیں، چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے انہیں بار بار دفتروں کے چکر نہ کاٹنے پڑیں یا رشوت نہ دینی پڑے، محض اسلامی نظام کی خالی خولی باتیں انہیں مطمئن نہیں کر سکتیں۔

پاکستان کا قومی تشخص اُبھارنے کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر خودداری کے جذبہ کی آبیاری کی جائے۔ مثلاً دیگر ملکوں کے سامنے قرضوں کی بھیک کی خاطر ہاتھ پھیلانے بند کئے جائیں اور صرف اپنے وسائل اور افرادی قوت پر بھروسہ کیا جائے۔ بالخصوص قرضے معاف کرانے کی عادت تو بالکل چھوڑ دینی چاہیئے۔ ہم کوئی یتیموں اور مسکینوں کی قوم نہیں کہ خیرات پر گزر اوقات کریں۔

●●

نمائندہ خصوصی

گوادر

پاکستان کے کسی بھی شہری کو یہاں امیگریشن ایکٹ کے چھرے سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔

گوادر پاکستان سے باہر ہے یا پاکستان گوادر سے باہر؟ یہ مسئلہ آج کل گوادر کے باشندوں کے لئے لاینحل بنا ہوا ہے۔ بیشک گوادر پاکستان کے انتہائی مغربی کونے پر ایک ساحلی شہر ہے، مگر حکومت نے اسے "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق بالکل فراموش کر رکھا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس شہر، بلکہ سارے ضلع کے باشندے مقامی انتظامیہ کے رحم و کرم پر ہیں۔ نوکر شاہی کی خو بو تو ایک عذاب تھی ہی، "کرپشن" کی لعنت نے رہی سہی کسر نکال کر رکھ دی ہے۔ اب انتظامیہ کے ملکی "صاحب لوگ" ہیں جو اختیارات کے بے لگام گھوڑے پر سوار رہتے ہیں اور اس قدر برق رفتار ہیں کہ غریب عوام پیدل رہ کر ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ظاہر ہے کہ "حاکم" اور "محکوم" میں اتنے فاصلے ہوں، تو "محکوموں" کے مسائل کو سننے، سمجھنے اور حل کرنے کی نوبت ہی کب آ سکتی ہے؟

عوام کا تاثر ہے کہ بعض حکام نے تو جان بوجھ کر عوام کے لئے مسائل پیدا کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے تاکہ وہ یہ ظاہر کر سکیں کہ "اسلامی نظام" اور "اسلامی عدل و انصاف" کا نام لینے والوں کے دور میں عوام کا یہی حال ہوتا ہے۔ آئین اور قانون کی نظر میں پاکستان کا کوئی بھی شہری، پاکستان کے اندر جہاں چاہے سکونت اختیار کرتا ہے اور کاروبار کر سکتا ہے۔ پاکستان کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے کسی پرمٹ یا راہداری کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، مگر ملاحظہ ہو گوادر کے حکام کی قانون دانی اور قانون پر عملدر آمد کرانے میں پھرتی کہ ادھر گوادر ایئرپورٹ پر کوئی غیر بلوچستانی نمودار ہوا اور ادھر وہ ان کی گرفت میں آیا۔ گرفت میں آنے کے بعد اس پر امیگریشن ایکٹ کا اطلاق کچھ مشکل نہیں ہوتا اور بھیسر پاکستانی باشندہ، اپنے ہی ملک کے ہوائی اڈے پر اترنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھا رہا ہوتا ہے۔

مکران کا ساحلی علاقہ وسائل سے محروم ہے۔ اکثر آبادی تعلیم جیسی بنیادی ضرورت سے محروم ہے۔ لوگ عام طور پر ملازمت، روزگار وغیرہ کی تلاش میں خلیج کی ریاستوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ہنرمندوں اور کاریگروں کی شدید قلت ہے، لیکن جو لوگ گوادر میں مقیم ہیں، بہرحال ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مزدوروں، ہنرمندوں اور کاریگروں کی ضرورت رہتی ہے۔ بعض دفعہ یہ کاریگر اور اہل ہنر صوبہ بلوچستان سے باہر کے شہروں سے منگوائے جاتے ہیں، مگر یہ قسمت کے مارے "قسمت آزمائی" کے لئے جونہی گوادر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں، تو اس ناکردہ "جرم" میں دھر لئے جاتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ ضرور ایران یا ریاستوں کو جانے کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔ بجائے اس کے کہ سرحدوں پر حفاظتی انتظامات بہت سخت کئے جائیں اور انسانوں کی سمگلنگ کی روک تھام کے لئے مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر نووارد کو پکڑ لیا جاتا ہے۔

گوادر میں بنیا پاور ہاؤس زیرِ تعمیر ہے۔ شفیع محمد نامی ٹھیکیدار نے کوئٹہ کے محمد ابراہیم نامی ایک کاریگر سے کراچی میں بات چیت کی اور اسے گوادر بلایا۔ محمد ابراہیم گوادر ایئرپورٹ پر اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ ٹھیکیدار کو علم ہوا، تو اس نے حکام کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایف آئی اے نے ابراہیم کے خلاف قائم کیا ہوا مقدمہ، ٹھیکیدار کی ضمانت پر ختم کرا کے ابراہیم کی رہائی کی سفارش کر دی، مگر "حاکم مجاز" نے ابراہیم پر امیگریشن ایکٹ کے تحت نیا مقدمہ قائم کر دیا اور اسے سزا دے کر تربت جیل بھجوا دیا۔ اسی طرح کے چند اور واقعات بھی پیش آئے ہیں۔

ریڈیو، ٹی وی، سائیکل، موٹر سائیکل اور لانچ کشتیوں کے انجن مرمت کرنے والے، گھڑی ساز، فوٹو گرافر، کوٹ پتلون سینے والے درزی، راج، معمار، فرنیچر ساز وغیرہ ایسے کاریگر ہیں جن کا مقامی طور پر ملنا محال ہے۔ ایسے لوگ دوسرے صوبوں اور دوسرے شہروں ہی سے آئیں گے۔ اب اگر گوادر پاکستان کا حصہ ہے، تو یہاں پاکستانی شہریوں کو ملازمت اور روزگار کے لئے آزادی سے آنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ زیرِ تجویز میرانی ڈیم اور مارہ میں ٹی وی بوسٹر یا گوادر میں سکول کالج کی عمارت کی تعمیر کے لئے کاریگر کہاں سے آئیں گے؟ اور کیا ان پر بھی امیگریشن ایکٹ لاگو ہو گا؟ موجودہ صورتحال سے صرف نوواردوں ہی کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، بلکہ گوادر کے شہری بھی گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ تعمیراتی کام، فرنیچر کی مرمت وغیرہ جیسے معمولی کام کے لئے موزوں آدمی نہیں ملتا۔ کئی موٹر لانچیں مرمت کی غرض سے بے کار پڑی ہیں۔ غریب ماہی گیر بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ مچھلی کی پیداوار متاثر ہو رہی ہے۔ قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے اور مقامی آبادی اتنی غریب ہے کہ مچھلی اس کی دسترس سے باہر ہو رہی ہے۔ اس مہنگائی کی وجہ سے آبادی میں بے چینی پھیل رہی ہے۔ جہاں تک انسانوں کی سمگلنگ کی روک تھام کا تعلق ہے، تو آج تک کسی "ایجنٹ" کو نہ پکڑا گیا نہ سزا دی گئی۔ سمگلنگ روکنے کے بہانے پاکستانی شہریوں اور گوادر کے باشندوں کو ناحق مصیبت میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ لوگوں کو تکلیف پہنچا کر اور ان کی تکالیف میں اضافہ کر کے انہیں دانستہ یا نادانستہ اس حکومت سے بدظن کیا جا رہا ہے جو حالات کو سدھارنا چاہتی ہے۔

گوادر کے شہری بعض دوسرے مسائل سے بھی دوچار ہیں۔ بظاہر تو یہ معمولی مسائل ہیں، مگر ان مسائل نے شہریوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے چونگی کا ٹھیکہ پانچ لاکھ روپے میں نیلام کیا ہے، مگر شہریوں کی سہولت کے لئے انتظامات مفقود ہیں۔ بجلی پانی تو دور کی بات ہے، گلی کوچوں کی صفائی تک کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ ہر طرف گندگی پھیلی رہتی ہے۔ شہر میں سول ہسپتال ہے، مگر اس میں عملہ کم اور ادویات اکثر نایاب ہیں۔ ایمبولینس گاڑی مریضوں کے بجائے ڈاکٹر صاحب کے رشتے داروں کے کام آتی ہے۔ کسی کو ضرورت کے تحت تاریخ پیدائش کا تصدیق نامہ حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے کم از کم پانچ سو روپیہ کا نذرانہ دینا پڑتا ہے۔ ویسے عام ویکسی نیشن وغیرہ کا سرٹیفکیٹ تیس روپے میں مل جاتا ہے۔ ضلع میں ڈی ایچ او صاحب نہیں ہیں، اس لئے مریض اور تمام حاجت مند سول ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب بہادر کے رحم و کرم پر ہیں۔ پورے ضلع گوادر کے لئے ایک ٹریکٹر مخصوص ہے، مگر اس کا قیام ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تربت میں ہوتا ہے۔ اگر کسی ضرورت مند کو یہ ٹریکٹر لانا ہو تو منظوری حاصل کرنے اور خود ٹریکٹر لانے کے لئے اسے تربت کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات صرف ٹریکٹر تک محدود نہیں، بلکہ گوادر کے حصے کا راشن بھی کراچی سے آ کر پسنی اتر جاتا ہے اور پھر ساٹھ ستر میل کا سفر کر کے ٹرکوں کے ذریعے گوادر پہنچتا ہے، حالانکہ یہ غلہ بحری جہاز کے ذریعے براہِ راست گوادر بھی پہنچ سکتا ہے۔ پسنی میں اس غلے کو ٹرکوں پر لادنے کے لئے مزدور گوادر سے پسنی جاتے ہیں۔ بارشیں ہو جائیں اور راستے بند ہو جائیں، تو ٹرکوں کی آمدورفت ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے غلے کی ترسیل بھی رک جاتی ہے۔ ضرورت ایسے جہازوں کی ہے جو پسنی کی طرح گوادر بھی رک سکیں اور غلہ اتار سکیں۔ مکران اور گوادر کے جو لوگ بیرونِ ملک جانے کی خواہش رکھتے ہوں، انہیں "پی فارم" حاصل کرنے کے لئے کراچی کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر نیشنل بینک گوادر سے یہ فارم مہیا کرنے کا انتظام ہو جائے، تو عوام کو صرف فارم حاصل کرنے کے لئے کراچی کے سفر سے نجات مل جائے گی۔ ●●

مذہبؑ قومیّت کی اساسؑ ہے

کچھ عرصے سے قومیّت کی بحث زوروں پر ہے اس کا آغاز جناب غوث بخش بزنجو کے زہریلے بیانات سے ہوا۔ ذیل میں جناب عبدالستار غزالی نے اس مسئلے کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔

قومیّت ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کے صاف اور واضح فہم وادراک پر ہی ہر ایک قوم کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، لیکن ہمارے یہاں قومیّت کا مسئلہ ابہام کا شکار ہے۔ جب بھی اس مسئلہ پر بحث چھڑتی ہے تو ہم تحریک پاکستان پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔

آج کل مسئلہ قومیت پر بحث چھڑی ہوئی ہے جو کہ جناب غوث بخش بزنجو صاحب کے اس بیان سے شروع ہوئی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ مسلم قومیت نام کی کوئی چیز نہیں اور قرآن میں مسلم قومیت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بزنجو صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان چار قومیتوں پر مشتمل ہے جو کہ صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب اور سندھ میں آباد ہیں۔

میرے خیال میں بزنجو صاحب کے بیان کے جواب میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں اس مسئلے کی اصل تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ بیشتر جوابی مضامین کا موضوع نظریۂ پاکستان رہا ہے، لیکن اگر ہم مسئلہ قومیت کے تاریخی ارتقاء اور اسلامی دنیا میں قوم پرستی کا جائزہ لیں، تو یہ ابہام شاید دُور ہو سکے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج کے جدید دَور میں قومیت کیا چیز ہے اور موجودہ شکل میں یہ کیسے وجود میں آئی!

قومیّت ایسے افراد کے گروہ کی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو ثقافتی یک جہتی رکھتے ہوں، ایک علاقہ میں ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں اور اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ ان کا ایک علحدہ اجتماعی وجود ہے اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔

ایسے لوگوں میں اپنے اجتماعی حلقے کے ساتھ وفاداری اور اس کو خوشحال بنانے کے لیے کام کرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ یہ جذبۂ ہم خیالی اور ایک دوسرے سے قربت بعض اوقات دوسرے گروہوں سے علحدگی کا احساس بھی پیدا کرتا ہے، جس کا اظہار یہ اجتماعی گروہ اپنی آزادی، خوشحالی، قومی قوت اور وقار حاصل کرنے کے لیے متحدہ جدوجہد کر کے کرتا ہے۔

دراصل قومیت کا مطلب ایک اجتماعی گروہ کے ساتھ وفاداری ہے جو دوسری تمام وفاداریوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس میں اس گروہ کے کارناموں پر فخر اور اس کی برتری پر یقین، حتیٰ کہ اس کو ایسے دوسرے تمام اجتماعی حلقوں سے برتر سمجھنا بھی شامل ہے۔ اسی لیے قومیّت کا تصوّر جارحیت کی طرف بھی لے جاتا ہے۔

قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو کہ مختلف رشتوں یعنی سیاسی، نسلی، مذہبی، ثقافتی، لسانی اور تاریخی سے منسلک ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی قوم کو بنانے کے لیے یہ سب رشتے موجود ہوں۔ مثال کے طور پر سوئٹزرلینڈ ایک متحد ملک ہے، حالانکہ وہاں تین علاقوں میں تین مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح نسل اتحاد پیدا کرنے والا ایک قومی رشتہ ہے، لیکن دنیا میں بہت سی قومیں ہیں جہاں ایک سے زیادہ نسلیں آباد ہیں۔ یہی حال مذہب کا ہے جو اتحاد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، لیکن ایک ملک میں ایک سے زیادہ مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔

درحقیقت قومیت کے معاملہ میں سب سے اہم چیز ایک ہمہ گیر خواہش کی موجودگی ہے، یعنی متحدہ طور پر رہنے اور کام کرنے کا زبردست جذبہ قومی اتحاد کے لیے کافی ہے۔ مشہور اطالوی مفکر مازینی کہتا ہے: "انسانیت کی خدمت کے لیے ایک مشن پورا کرنے کی غرض سے کام کرنے کے احساس کا نام قومیت ہے۔ اس کا دارومدار نسل یا نسب پر نہیں، بلکہ ایک مشترک فکر اور مشترک منزل پر ہے۔"

آئیے اب ہم ان عناصر کا تفصیلی جائزہ لیں، جن کی بدولت قومیں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

لسانی رشتہ

قومیت کی تعمیر میں قومی زبان سب سے اہم عنصر، بلکہ اسے قومیت کا سب سے نمایاں پہلو کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہی زبان بولنے والے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس لیے ان میں قربت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو ان میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسی لیے قومی زبان ایک علحدہ ثقافت اور رہن سہن کو جنم دیتی ہے۔ عرب قومیت کی بنیاد لسانی اتحاد پر ہے۔ مختلف عرب ممالک میں رہنے والے لوگ ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن ان کی زبان مشترک ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک قومی زبان اجتماعی شعور پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ بلجیم اور کینیڈا میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانیں موجود ہیں، جب کہ سوئٹزرلینڈ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک قوم میں متعدد زبانوں کی موجودگی ایک مشکل صورتِ حال پیدا کر دیتی ہے، لیکن دوسرے عناصر اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیرونی حملہ کا خطرہ ضروری قومی اتحاد پیدا کر دیتا ہے۔

نسلی رشتہ

قومیت کی تعمیر میں زبان کا عنصر نسل کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب کچھ لوگوں میں یہ جذبہ (خواہ صحیح ہو یا غلط) پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مشترک بلکہ منفرد نسل سے تعلق رکھتے ہیں، تو ان میں اپنی نسل پر فخر اور ایک اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے جو کہ قوم پرستی کی رُوح ہے اور بعض اوقات وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ سب سے افضل نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ دَور میں اس کی مثال نازی جرمنی اور جاپان ہیں۔ نازی جرمنی میں ہٹلر کی پروپیگنڈہ مشینری نے لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ جس نارڈک نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ دنیا کی سب سے افضل نسل ہے۔ اسی طرح دوسری جنگِ عظیم سے قبل جاپان نے اپنے عوام میں جنون کی حد تک قوم پرستی کا احساس پیدا کیا۔

مذہب کا رشتہ

قومیت کی راہ میں مذہب نے ہمیشہ سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ درحقیقت ابتدا میں قومیت کا جذبہ دراصل مذہبی اخوّت سے پیدا ہوا۔ قرونِ اُولیٰ میں آدمی کی سب سے بڑی وفاداری کا مرکز اس کا مذہب تھا، لیکن آج اس کی جگہ مملکت نے لے لی ہے۔ آج کے دَور میں بڑا اسماج دشمن "غدار" کہلاتا ہے، جب کہ پہلے

"بدعتی" کو سماج کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔

زیادہ تر مذاہب آج کل قومی مملکتوں کی حدود سے باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یعنی کوئی مذہب، اسلام، عیسائیت، نصرانیت وغیرہ کسی ایک سرزمین سے وابستہ نہیں ہیں۔ آج کے دور میں مذہبی قیادت کے لیے بھی یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ قومی پرچم سے وفاداری اور لادینی حکومت کی تابعداری کی تلقین کرے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید دور میں مذہبی قیادت میں اتنی سکت نہیں رہی کہ وہ مملکت کی طاقت کا مقابلہ کر سکے اور اس طرح لوگوں کی وفاداری حاصل کر سکے۔

اقتصادی عناصر

مضبوط قوموں کی شکل میں دنیا کی تقسیم کی ایک بڑی وجہ اقتصادی عناصر بھی ہیں۔ قرونِ وسطٰے کے آخر میں زبردست اقتصادی اور تجارتی پھیلاؤ نے بڑی قومی مملکتوں کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا۔ اہم ایجادات کے بعد نوآبادیاتی نظام نے مملکتوں کے مابین اختلافات کو ہوا دی اور اس طرح ہر مملکت نے ایک علٰحدہ قومی حیثیت حاصل کرنا شروع کی۔

قومیت کا ارتقاء

ان عناصر کی بحث کے بعد جن سے کہ قومیں معرضِ وجود میں آتی ہیں، اب ہم قومیت کے تاریخی ارتقاء کی جانب آتے ہیں۔

اگرچہ قومیت جدید دور کی پیداوار ہے، لیکن اس کی بنیاد درحقیقت اس وقت پڑی تھی، جب کہ انسان نے اپنے آپ کو قبیلوں کی شکل میں منظم کیا۔ جدید دور کی قومیت میں قبیلہ کی بہت سی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر گہری مذہبی وفاداری، قبیلہ سے وفاداری، مقامی کارناموں پر فخر اور بربریت جیسی نفرت کا اظہار۔

قومیت پرستی کے پہلے آثار ہمیں مدنی ریاستوں کے دور میں نظر آتے ہیں، جب کہ دفاع، اقتصادی فوائد اور مذہبی اقدار کی وجہ سے لوگ ایک نئے مرکز پر جمع ہوئے۔ مقامی اور بیرونی تجارت کے فروغ کے باعث قبائلی نظام ٹوٹنا شروع ہوا اور جدید سیاسی نظام کے اولین آثار نمودار ہوئے۔ ایتھنز کی مدنی ریاست اس کی بہترین مثال ہے جہاں اجتماعی اتحاد کا زبردست جذبہ نمودار ہوا۔

جدید قومیت

جدید قومیت کی ابتدا کی تاریخ متعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے پس منظر میں سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ذہنی قوتوں نے اپنا کردار آہستہ آہستہ ادا کیا۔ علاوہ ازیں مختلف علاقوں میں وہاں کے حالات کے مطابق ان کی رفتار بھی مختلف تھی۔ بعض محققین کی رائے میں موجودہ شکل میں قومیت کی ابتداء اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی انقلاب کے دور سے شروع ہوئی۔

اس انقلاب نے اقتدارِ اعلیٰ بادشاہ کے بجائے عوام کے سپرد کر دیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک پوری قوم، جس میں عوام کے تمام طبقے شامل تھے، مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اس طرح ایک نئی قسم کی تنظیم اور جذباتی اپیل کے ذریعہ فرانس، شاہی طاقتوں کی بہترین تربیت یافتہ افواج کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔

لیکن یہ قوم پرستی فرانس تک محدود نہیں رہی۔ انقلابی جنگوں کے نتیجے میں قوم پرستی کا نظریہ دوسری یورپی اقوام، جرمنوں، اطالویوں اور ہسپانویوں تک پہنچا۔ ان کی قوم پرست بغاوتوں کی وجہ سے وہ وسیع سلطنت زوال پذیر ہوئی جو نپولین کی قیادت میں لڑنے والی انقلابی افواج نے قائم کی تھی۔

اُنیسویں صدی کو ہم "جدید قومیت" کا سب سے بڑا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس صدی میں قومیت کے غیر معمولی اظہار کی سب سے بڑی وجہ پہلا صنعتی انقلاب تھا۔ جدید مملکتوں میں صنعت اور تجارت کی وجہ سے معاشرے میں مجموعی طور پر زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ وسیع بنیاد پر صنعتی پیداوار نے تجارت کا رُخ موڑ دیا۔ کارخانوں نے مزدوروں اور متوسط طبقے کو جنم دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں "قومیت" نے انتہائی شکل اختیار کر لی۔ اس کی وجہ جدید صنعتی انقلاب تھا، جس نے یورپ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اقتصادی تعلقات اور اثر و رسوخ کو تمام دنیا میں پھیلائے۔

جدید مملکتیں

مختصراً قومیت اور قوم پرستی کی ابتدا مغربی یورپ، یعنی فرانس، انگلینڈ، سکاٹ لینڈ اور اسپین سے ہوئی اور یہاں سے یورپ کے باقی حصوں میں پھیلی، جب کہ دوسرے برِاعظموں میں اس کی ابتدا حال ہی میں ہوئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ موجودہ شکل میں اقتدارِ اعلےٰ رکھنے والی مملکتیں رسمی طور پر ۱۶۴۸ء کے ویسٹ پھالیہ معاہدۂ امن کے تحت یورپ میں معرضِ وجود میں آئیں۔ اس معاہدۂ امن کے تحت روم کی مذہبی سلطنت ٹوٹ کر اختیارِ اعلیٰ رکھنے والی ریاستوں میں بٹ گئی۔

اس طرح مرکوز جمہوری مملکتوں میں طاقتور قوموں کی تنظیم انسانی تاریخ کے لیے بالکل نئی بات ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر قوم پرستی یا حقِ خود اختیاری کے اصول نے جسے امریکی صدر ۔ وڈرو ولسن نے جنگ کا مقصد قرار دیا، مشرقی یورپ میں مقبولیت حاصل کی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ میں قوم پرستی نے فروغ حاصل کیا۔

●●

عالمِ اسلام میں قومیّت کا ارتقاء

قوموں کی بنیاد پر اسلامی مملکتوں کا قیام تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مرکوز جمہوری مملکتوں میں طاقتور قوموں کی تنظیم انسانی تاریخ کے لئے بالکل نئی بات ہے جس کی ابتدا اٹھارویں صدی کے انقلابِ فرانس سے ہوتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد مقامی علاقوں میں اسلامی مملکتیں تیزی سے وجود میں آئیں اور عملی طور پر پان اسلام ازم کا تصور یہ قرار پایا کہ ہر ایک اسلامی ملک کو انفرادی طور پر مضبوط اور خوشحال بنایا جائے اور یہ ممالک اسلامی اخوت کے جذبے کے تحت ایک دوسرے سے قریبی تعاون پیدا کریں۔

عالم اسلام میں قوم پرستی کی تحریکوں کا بنیادی محرک سامراجیت کے خلاف جذبہ تھا، یعنی غیر ملکی راج سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ مختلف اسلامی خطوں کے جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی حالات اور دیگر انفرادی خصوصیات کے باعث یہ تحریکیں مختلف نوعیت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا کی قوم پرستی کی تحریک ایک علٰحدہ نوعیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ترکی اور ایران کی قوم پرستی میں اسلام کا کردار نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ـــــ بلکہ متضاد رہا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد انڈونیشی مسلمانوں کی ولندیزیوں کے خلاف، شامی اور مراکشی عوام کی فرانسیسیوں کے خلاف اور ہندوستانی مسلمانوں کی برطانیہ کے خلاف مہم میں ایک بنیادی چیز مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے لئے مقام حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد۔

اگرچہ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان تحریکوں میں صرف اسلام کا جذبہ کارفرما تھا، ان میں اقتصادی، سماجی اور لسانی امور بھی شامل ہیں، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان تحریکوں میں اسلامی جذبہ سب سے نمایاں تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قومی آزادی کی ان تحریکوں میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا گیا۔ مثال کے طور پر عرب علاقوں میں عیسائی عربوں اور انڈونیشیا میں غیر مسلم باشندوں نے ان تحریکوں میں حصّہ لیا۔

بعض محققین کی رائے میں مغربی ممالک کی قوم پرستی کو اسلامی دنیا میں بہت آسانی کے ساتھ مؤثر طور پر اپنا لیا گیا ہے، لیکن ایسا سوچنا خوش خیالی ہے، کیونکہ یہاں وفاداریوں کی روایات اور اس نظریہ کو اپنانے والے جذبات مختلف ہیں۔ غیر ملکی سامراج کے خلاف قوم پرستی کی تحریک فوراً قابلِ قبول ہے، کیونکہ یہ آزادی

حاصل کرنے کا ایک مشترک جذبہ ہے، لیکن جب اس قوم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی اور آزاد ہوگئی، تو بغیر نظم وضبط کے ساتھ اس کی فلاح و بہبود کے لئے جدّوجہد کرنا بہت مشکل ہے. ماضی میں اسلام نے لوگوں میں یہ نظم وضبط جذبہ اور طاقت پیدا کی.

اس سلسلے میں ایک بنیادی نکتہ یہ بھی ہے کہ اسلامی دنیا میں جہاں بھی قوم پرستی کو اپنایا گیا وہاں متعلقہ قوم مسلمانوں پر مشتمل تھی اور ان لوگوں نے ایسا قوی جذبہ پیدا نہیں کیا جس کا مطلب کسی اور ایسے گروہ کے ساتھ وفاداری یا وابستگی ہو جو کہ اسلامی رشتے سے باہر ہو.

مسلمانوں کا جذبۂ اخوت معروف ہے، لیکن اس جذبے کا منفی پہلو یہ ہے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے علاوہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے لئے خواہ وہ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، اپنائیت کا احساس نہیں رکھتے.

اس سلسلے میں مغربی قوم پرستی بھی مستثنےٰ نہیں ہے. نظریاتی طور پر مغرب میں قوم پرستی نے قوم کو مذہبی اختلافات سے بالاتر وفاداری کا مرکز قرار دیا ہے، لیکن عملی طور پر یہ نظریہ وہاں سب سے زیادہ کامیاب رہا، جہاں یہ اختلافات فرقہ وارانہ یا ایک ہی مذہب کے اندر تھے حتیٰ کہ امریکہ میں بھی جو کہ مختلف قسم کے لوگوں کو اپنے یہاں آباد کرنے میں. بجا طور پر فخر کرتا ہے، ہندو، بدھ یا دوسرے مذاہب کے لوگوں کی تعداد کبھی زیادہ نہیں رہی. درحقیقت مغربی اقوام میں یہودیوں کے علاوہ کوئی غیر عیسائی گروہ نہیں آیا اور یہودیوں کے ساتھ بھی ان کا رویّہ بعض اوقات شرمناک حد تک بُرا رہا ہے.

بعض محققین کی رائے میں ایک بنیادی نظریہ کی حیثیت سے اسلام اور قوم پرستی ایک دوسرے کے خلاف ہیں، لیکن اس حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قوم اور قومیتوں کی بنیاد پر تقسیم در تقسیم ایک عملی صورتحال ہے اور مسلمان مختلف قوموں اور قومیتوں میں بٹے رہنے کے باوجود بھی مسلمان ہیں.

انیسویں صدی کے اسلامی مفکروں نے دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ عملی طور پر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ قابلِ انتظام حصّوں میں ہی ممکن ہے اور انہوں نے مقامی قوم پرستی کے فروغ کو اسلام کے منافی نہیں سمجھا.

جمال الدین افغانی پان اسلامی تحریک کے زبردست پیشواؤں میں سے تھے، — انہوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ مسلمان مختلف ریاستوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مختلف وطن ہیں؛ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے درمیان مشترکہ اسلامی بندھن اور بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ان مملکتوں کو باہمی تعاون کی تلقین کی.

"اسلامی اتحاد" کے عنوان کے تحت علامہ افغانی لکھتے ہیں:

"میں یہ نہیں کہتا کہ ان تمام (علحدہ مملکتوں میں) حکمران ایک شخص ہو، کیونکہ یہ مشکل ہوگا، لیکن یہ امید رکھتا ہوں کہ ان میں مشترک حکمرانی قرآن کی ہوگی اور مذہب ان کے اتحاد کی رہنمائی کرے گا. ہر خود مختار حکمران اپنی اقلیم میں دوسرے کی اعانت کرے، کیونکہ ہر ایک کی بقا کا انحصار دوسرے پر ہے. مذہبی بنیاد کے علاوہ بھی یہ باہمی اعانت وقت کے تقاضے کے مطابق ایک عملی ضرورت ہے".

جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ مذہب اور قوم پرستی کو ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھتے اور نہ علاقائی وفاداریوں کو پان اسلامک تحریک کے خلاف سمجھتے ہیں.

مولانا عبدہ کے شاگرد رضا رشید اپنے استاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ قوم پرستی جو ایک وطن میں رہنے والے مختلف عقائد کے لوگوں کی تہذیب کو فروغ دینے اور حکومت کی اصلاح کرنے کے سلسلے میں تعاون کسی صورت میں اسلام کے منافی نہیں. اسی طرح علامہ افغانی اپنے شاگردوں اور پیروکاروں کو قومی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں تمام مشرقی مملکتوں کے لوگوں کے مابین اتحاد اور تعاون کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے. ان کی سیاسی جماعت مختلف برادریوں کے ذہین لوگوں پر مشتمل تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کو خود اصلاحی اور فرقوں سے قطع نظر تمام مسلمانوں میں اخوت کے رشتہ کو مضبوط کرنے کی تلقین کرتے تھے".

(تاریخ الاستاد الامام مولفہ محمد رشید رضا قاہرہ)

ایک اور مشہور مصری مفکر شیخ الجامعہ الازہر رفیع الطہطاوی لکھتا ہے:

"محبت کے جذبہ کے تحت آدمی وطن کو تہذیب یافتہ دیکھنا چاہتا ہے اور قانون بنانے والے بھی اس کی تلقین کرتے ہیں. حدیث ہے: وطن کی محبت اعتقاد کا ایک جزو ہے. علاوہ ازیں عمرؓ بن خطاب کہتے ہیں: خدا نے زمین کو (آدمی کی) وطن سے محبت کے ذریعہ خوش حال کیا......"

آگے چل کر شیخ الازہر کہتا ہے:

"ایمان رکھنے والے اور اس کے بھائی کے درمیان جو باہمی ذمہ داری ہے، اگر قوم پرستی کے جذبہ کے تحت اس میں اسی وطن میں رہنے والے غیر مسلم کو بھی شامل کرلیا جائے، تو کوئی مضائقہ نہیں. اس لئے کہ یہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے کہ جو لوگ ایک وطن میں رہتے ہیں وہ اس کے نظام کی بہتری اور تکمیل کے لئے تعاون کریں".

علامہ اقبال "اسلام میں مذہبی افکار نو کی تعمیر" میں فرماتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ آہستہ آہستہ ہمیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اسلام نہ تو قوم پرست ہے اور نہ سامراجیت پرست، بلکہ یہ اقوام کا اتحاد ہے جو کہ مصنوعی حدود اور نسلوں کو صرف نشاندہی کے لئے تسلیم کرتا ہے، نہ کہ اس (اقوام کے اتحاد) کے ممبروں کے سماجی افق کو محدود کرنے کے لئے".

دراصل اسلامی جذبۂ اخوت کے دو مثبت پہلو ہیں. ایک یہ کہ مسلمانوں کے کسی ایک اجتماعی گروہ میں ہم آہنگی کا شدید احساس پیدا کیا جائے، یہ جذبہ پاکستان بنانے میں مؤثر ثابت ہوا. علاوہ ازیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد مسلمانوں میں قوم پرستی کی تحریک اسی جذبہ کے تحت شروع ہوئی. جذبۂ اخوت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے اجتماعی طور پر جذبات رکھنا. پہلا جذبہ مقامی قومیت کو مضبوط بناتا ہے، جب کہ دوسرا پان اسلامی ہے.

اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اور قوم پرستی ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بلکہ ایک ہی جذبات کے دو پہلو ہیں اور حالات کے مطابق ان میں سے کسی ایک جذبہ کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے.

اس بحث کے بعد ہمارے نظریۂ قومیت سے یہ ابہام دُور ہو جاتا ہے کہ ہم پہلے پاکستانی ہیں یا مسلمان. جہاں تک مذہب کا معاملہ ہے وہ ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں اور جہاں قومیت کا معاملہ ہے، وہاں ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں.

●●

پاکستانی قومیت کا تصوّر پاکستان بننے سے پہلے وجود میں آیا

ہر قوم مختلف مفادات اور نظریاتی گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ مفادات اور نظریات ایک دوسرے کے مخالف بھی ہوتے ہیں، اب یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف عناصر کو کس طرح متحد رکھا جائے کہ یہ کم از کم پُرامن طور پر رہ سکیں.

قدیم اقوام میں قومیت اور قومی شعور کا مسئلہ کئی صدیوں قبل طے ہو چکا ہے. مثال کے طور پر فرانسیسی یا چینی اپنی قوم کی پیدائش کے لئے کسی خاص واقعہ یا سال کی طرف اشارہ نہیں کرسکتے. ایسی قدیم قومیں اپنی زمین پر صدیوں سے آباد ہیں. ذاتی لگاؤ اور قومی اجتماعیت کے ساتھ وفاداری صرف وقت گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، یعنی اس حقیقت سے کہ قوم ایک عرصہ سے معرضِ وجود میں ہے.

یہ مسئلہ اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے، جبکہ ایک قوم یا سیاسی وحدت مختلف سماجی، لسانی، ثقافتی اور مذہبی عناد پر مشتمل ہو.

یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مختلف عناصر میں مشترک لگاؤ پیدا کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ جدید دور میں قوم کا تصور مملکت کے تصور سے گہرا رابطہ رکھتا

ہے، لیکن مختلف حالات اور مختلف مقامات پر قوم اور مملکت کے مابین رشتہ مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات مملکتیں قوموں سے پہلے وجود میں آتی ہیں، جیسا کہ مغربی یورپ میں ہوا، جبکہ بعض اوقات قومیں مملکتوں سے پہلے معرض وجود میں آتی ہیں جیسا کہ مشرقی یورپ میں۔

پاکستان سے محبت

اسلام سے محبت کے مترادف ہے۔

پاکستان کو ہم دوسرے زُمرے میں شامل کرتے ہیں، کیونکہ پاکستانی قومیت کا تصور یا پاکستانی قوم کا وجود پاکستان بننے سے پہلے معرض وجود میں آیا۔ یہاں اس بحث میں الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ پاکستان کیوں معرض وجود میں آیا۔ اس وقت ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سب پاکستانی ہیں اور بحیثیت ایک پاکستانی قوم کے ہماری تمام تر وفاداری اپنے وطن عزیز سے ہونی چاہیئے۔

مختلف اقوام میں قومیت کے جذبے کا تعین وہاں کے مقامی حالات کرتے ہیں، کیونکہ عوام کی ذہنی کیفیت میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہم قوم پرستی کے جذبہ میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ امریکہ میں جنگِ آزادی اس قوم پرستی کے جذبہ کے تحت لڑی گئی جس کی تلقین مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے کی تھی، جبکہ ہسپانوی۔ امریکی جنگ سامراجیت کے جذبے کے تحت لڑی گئی اور اس صدی کے شروع میں یورپ اور لیگ آف نیشنز سے علیحدگی کنارہ کشی کے جذبے کے تحت کی گئی۔

اسی طرح ہم پاکستان میں جذبۂ قومیت کے ارتقاء میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ تقسیم سے قبل اسلام نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کے لئے جدوجہد کی گئی۔ اب جبکہ یہ ملک ایک عرصے سے قائم ہے، اسلام کے جذبے کے تحت اسے متحد اور مستحکم رکھنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "قومیت" کوئی فطری پیداوار نہیں، بلکہ یہ ایک طویل طریقہ کار ہے جو کہ نقطہ عروج پر اس وقت پہنچتا ہے، جبکہ کچھ لوگ ایک طویل مدت ایک ساتھ رہ کر اور کام کر کے گزارتے ہیں۔

میرے خیال میں تیس سال کا طویل عرصہ ہمیں ایک پاکستانی قوم بنانے کے لئے کافی ہے، لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے یہاں کبھی "قومیت" کو فروغ دینے کی تلقین نہیں کی گئی۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہم پاکستانی ہیں اور ہماری سب سے بڑی وفاداری ہمارے ملک سے ہونی چاہیئے، بلکہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ ہم صرف مسلمان ہیں اور بس

ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے ما است

پاکستان ایک قومی مملکت ہے اور قیام پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریۂ قومیت ہے، لیکن سب سے بڑی وفاداری ان جغرافیائی حدود سے ہوتی ہے جن میں کوئی قوم آباد ہو اور اس سے پاکستان بحیثیت ایک قوم کے مستثنٰی نہیں ہے۔

افراد کو قوم بنانے والی بنیادی چیز دراصل وہ جذبہ ہے جو ان سب میں ایک روح بن کر پھیل جاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ تین چیزوں سے مرکب ہو سکتا ہے، یعنی وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت اور معاشی مفاد پرستی۔ پاکستانی عوام کو ایک قوم بنانے میں یہ تینوں عوامل شامل ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افراد کو قوم بنانے کے لئے صرف اس مشترک جذبہ کی موجودگی کافی نہیں جو کہ ان سب میں روح بن کر پھیل جائے، بلکہ اس جذبہ کا اتنا طاقتور ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ ان تمام عناصر کو دبا دے جو افراد یا افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔

پاکستانی قومیت میں اسلامی اخوت کا مشترک جذبہ نہ صرف لوگوں میں ضروری اتحاد پیدا کرنے کے لئے کافی ہے، بلکہ ایسے تمام عناصر کے خلاف ایک زبردست قوت کی حیثیت رکھتا ہے جن سے ملک کی سلامتی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

پاکستان کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے لوگ ملک کی جغرافیائی حدود سے محبت کریں اور ان سے وہ جذباتی لگاؤ پیدا کریں اور یہ محبت پیدا کرنے کے لئے پاکستانی قومیت کا تصور پیدا کرنا ضروری ہے، لیکن ہم نے آج تک براہِ راست زمین کی بنیاد پر یہ محبت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، یعنی اس لحاظ سے کہ ہم پاکستانی ہیں اور وہ ملک جس سے ہمارا مفاد وابستہ ہے، ہمیں اس سے محبت کرنی چاہیئے۔ اس کے برعکس ہم نے ہمیشہ اپنی قوم سے یہ کہا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اس لئے ہمیں اس ملک سے محبت کرنی چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان سے محبت اسلام سے محبت کے مترادف ہے۔

رہا پاکستان میں چار قومیتوں کا سوال، تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ ملک چار صوبوں پر مشتمل ہے جہاں کے لوگ مختلف زبان اور ثقافت رکھتے ہیں اور ہر قومیت کو اپنی زبان اور ثقافت کو فروغ دینے کا حق حاصل ہے۔ دراصل ہمارے یہاں قومیتوں کا تصور ہمارے قومی ابہام اور مادی بے انصافیوں کا نتیجہ ہے۔ انہی بے انصافیوں کے باعث ہمیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دن دیکھنا پڑا اور دوسری طرف موجودہ پاکستان میں قومیتوں کی بات بھی انہی بے انصافیوں کا نتیجہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے، تو بے جا نہ ہو گا کہ تقسیم سے قبل "دو قومی نظریہ" اگر ہندو استحصال کے خلاف ایک ردِ عمل تھا، تو آج قومیتوں کا نعرہ پاکستان کے اندر ہونے والے استحصال کا شاخسانہ ہے۔

■■

شہر لاہور کی خصوصی دکان

اِرم ساڑھی ہاؤس

جدید فیشن، نت نئے ڈیزائن اور وسیع ترین انتخاب میں
● ٹشو ● کمخواب ● گرم شالیں ● ریشمی ● کامدانی ● غزارہ ● سلمہ سوٹ اور بنارسی وعروسی ملبوسات

ہر دلہن کی پسند، ہر سہاگن کا انتخاب

اِرم ساڑھی ہاؤس ۱۵۰ انارکلی لاہور

نثار الحق

کرکٹ ٹیم کا دورۂ نیوزی لینڈ و آسٹریلیا

پاکستانی کرکٹ ٹیم کامیاب واپس آئے گی

پاکستانی کرکٹ ٹیم نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے دورے پر عنقریب روانہ ہونے والی ہے۔ یہ ٹیم نیوزی لینڈ کے خلاف تین اور آسٹریلیا کے خلاف ۲ ٹیسٹ میچ کھیلے گی۔ اس دورے کے لئے قومی ٹیم کے ناموں کا اعلان ہو چکا ہے۔ مشتاق محمد حسبِ سابق ٹیم کے کپتان منتخب کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کھلاڑی یہ ہیں آصف اقبال (نائب کپتان)، ماجد خان، ظہیر عباس، جاوید میاں داد، وسیم باری، ہارون رشید، عمران خان، مدثر نذر، سرفراز نواز، طلعت علی، محسن حسن خان، اقبال قاسم، سکندر بخت، اشرف علی اور انور خان۔

سولہ کھلاڑیوں میں صرف ۲ کھلاڑی ایسے ہیں جنہوں نے کوئی ٹیسٹ نہیں کھیلا۔ یہ دونوں وکٹ کیپر بیٹسمین اشرف علی اور آل راؤنڈر انور خان ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی بھارتی ٹیم کے خلاف بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اشرف علی اور امین لاکھانی نے تقریباً ملتان میں بھارت کو شکست دے دی تھی اور انور خان کی تباہ کن باؤلنگ کے سبب بھارت کو پشاور میچ میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جو قابلِ ذکر کھلاڑی موجودہ ٹیم میں منتخب نہیں ہو سکے وہ صادق محمد، وسیم راجہ، حسن جمیل اور امین لاکھانی ہیں۔ صادق محمد کی کارکردگی کافی عرصہ سے قابلِ اطمینان نہیں رہی تھی، لیکن پھر بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ انہیں اس طرح ٹیم سے نکال دیا جائے گا۔ خیال اغلب تھا کہ انہیں سولہ کھلاڑیوں میں شامل رکھا جائے گا، لیکن سلیکٹرز صاحبان نے صادق پر طلعت کو ترجیح دی۔ طلعت علی نے بہاولپور میں بھارت کے خلاف سنچری بنائی تھی اور اس کے بعد قائد اعظم ٹرافی میں بھی انہوں نے بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اسی لئے انہیں تجربہ کار صادق پر ترجیح دی گئی۔ وسیم حسن راجہ پاکستان کے بہت ہی اچھے آل راؤنڈر ہیں۔ انگلستان کے دورے پر گئی قومی ٹیم کے وہ نائب کپتان تھے۔ اس دورے میں پاکستان کو شرمناک شکست ہوئی۔ اس کے بعد انہیں نہ بھارت کیخلاف کھلایا گیا اور نہ ہی موجودہ دورے کے لئے منتخب کیا گیا۔ حسن جمیل بھی نوجوان آل راؤنڈر ہیں اور ایک عرصہ سے قومی ٹیم کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں، لیکن ٹیم میں ان کے لئے بھی جگہ نہیں بن سکی۔ انور خان نے بولنگ میں ان پر سبقت حاصل کر لی اور منتخب کر لئے گئے۔ امین لاکھانی کو غالباً اس لئے نہیں چنا گیا کہ وہ ابھی کم عمر ہیں۔ شاید سلیکٹر صاحبان ان میں پختگی کا عنصر لانا چاہتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی منتخب شدہ ٹیم خاصی متوازن اور تجربہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہے۔ بہت سے کھلاڑی تیسری یا چوتھی مرتبہ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا جا رہے ہیں۔ آٹھ کھلاڑی پہلے ہی کیری پیکر کی عالمی سیریز میں کھیل رہے ہیں۔ ماجد جہانگیر کے ساتھ اوپننگ کے لئے مدثر نذر، طلعت علی اور محسن خان میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ محسن خان مڈل آرڈر میں بھی کھیل سکتے ہیں، لیکن وہاں ہارون رشید بھی جگہ کے لئے امیدوار ہیں۔ ان تینوں میں سے جو بھی سائڈ میچوں میں اچھا کھیلا،

> **عمران اور سرفراز**
>
> **پاکستانی بولنگ کی**
>
> **جان ثابت ہوں گے**

اسے موقع دیا جائے گا۔ محسن خان ان تینوں میں بہتر کھلاڑی ہیں۔ نیوزی لینڈ میں ان کی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہیں، کیونکہ نیوزی لینڈ کی وکٹیں انگلستان کی وکٹوں کی طرح ہیں اور محسن انگلستان میں خاصے کامیاب رہے تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ محسن طلعت اور مدثر کی نسبت زیادہ اچھے سٹروک پلیئر ہیں، لیکن ایک مقام پر مدثر ان سے بازی لے جاتے ہیں، وہ یہ کہ مشتاق محمد انہیں بطور سٹاک سیمر (SEAMAR) کی حیثیت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ طلعت علی نے ۷۳-۱۹۷۲ء میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا دورہ کیا تھا، لیکن ڈینس للی نے ان کی انگلی توڑ دی تھی جس کی وجہ سے وہ کامیاب ثابت نہ ہو سکے تھے۔ تیسرے نمبر کے لئے ظہیر عباس ہیں جو آجکل بہت فارم میں ہیں۔ بھارت کے خلاف ان کی بیٹنگ کی یاد مدتوں نہیں بھلائی جا سکے گی۔ اب تک ظہیر عباس نیوزی لینڈ کے خلاف سات ٹیسٹ میچ کھیل چکے ہیں۔ ان ساتوں میں وہ بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ایک مرتبہ بھی ان کا سکور تیس سے نہیں بڑھ پایا، لیکن جس انداز سے انہوں نے بھارتی باؤلروں کی پٹائی کی اس کے پیشِ نظر ان سے بہت اچھے کھیل کی توقع بجا ہوگی۔ ان کی ناکامی کی صورت میں محسن خان یہ خلا پُر کریں گے۔ مڈل آرڈر میں پاکستان کے پاس آصف اقبال، مشتاق محمد، جاوید میاں داد اور ہارون رشید ہیں۔ نیوزی لینڈ کے خلاف مشتاق، آصف اور میاں داد کا ریکارڈ بہت ہی عمدہ ہے۔ مشتاق اور آصف نے ــــــــــ نیوزی لینڈ کے خلاف ۷۳-۱۹۷۲ء کے ڈنیڈن ٹیسٹ میں چھٹے وکٹ کی رفاقت میں ۳۵۰ رنز کا اضافہ کیا تھا جو اب تک پاکستانی ریکارڈ ہے۔ اس اننگز میں دونوں نے زندگی کا بہترین سکور بنایا تھا۔ یہ دونوں کھلاڑی آسٹریلیا کے خلاف بہت اچھا کھیلے تھے۔ جاوید میاں داد پچھلے دورۂ آسٹریلیا اور ویسٹ انڈیز میں ناکام رہے تھے، لیکن ہارون زیادہ اچھے بیٹسمین کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ ان دونوں میں جگہ حاصل کرنے کے لئے خوب مقابلہ ہوگا۔

آخری کھلاڑیوں میں عمران خان انتہائی قابلِ اعتماد بیٹسمین ہیں، ان کا ساتھ دینے کے لئے سرفراز نواز، وسیم باری اور سکندر بخت ہیں یہ تمام کھلاڑی خاطر خواہ رنز بنا سکتے ہیں، اس کا مظاہرہ انہوں نے حالیہ پاک بھارت سیریز میں انتہائی کامیابی سے کیا ہے۔

بولنگ کے شعبے میں پاکستان کے پاس دو انتہائی تجربہ کار بولر عمران خان اور سرفراز نواز کی صورت میں موجود ہیں۔ دونوں ہی آسٹریلیا کے خلاف سیریز میں بہت کامیاب رہے تھے۔ خاص طور پر عمران کی تباہ کن بولنگ کی وجہ سے پاکستان کو سڈنی میں کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ یہ دونوں کھلاڑی اب بھی پاکستانی بولنگ کی جان ثابت ہوں گے۔ ان کا ساتھ دینے کے لئے سکندر بخت اور نوجوان انور خان موجود ہیں۔ آصف اقبال بھی بوقت ضرورت میڈیم فاسٹ بولنگ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مدثر کو بھی سٹاک بولر کی حیثیت سے آزمایا جا سکتا ہے۔ اقبال قاسم واحد لیفٹ آرم سپن بولر ہیں۔ مشتاق محمد بہت ہی تجربہ کار لیگ سپنر ہیں۔ میاں داد ان کا ساتھ نباہ سکتے ہیں۔ نیوزی لینڈ ٹیم خاص طور

بریگ سپن بولنگ کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ثابت ہوئی ہے۔ یہ دونوں کھلاڑی وہاں بہت کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ٹیم کی فیلڈنگ کا معیار بہت زیادہ بہتر نہیں۔ گراؤنڈ فیلڈنگ کا جہاں تک سوال ہے، یہ بہت عمدہ ہے، لیکن کیچ پکڑنے کے معاملے میں پاکستان نے جس تساہل کا مظاہرہ پاک بھارت سیریز میں کیا' اس کا دہرانا کافی مہنگا ثابت ہو سکتا ہے۔

مشتاق محمد انتہائی تجربہ کار کپتان ہیں۔ وہ ٹیم کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہیں، ان کے سابقہ تجربہ اور کامیابی کے پیش نظر آئندہ کامیابی کی امید بہت زیادہ ہے۔

پاکستان کی طرح نیوزی لینڈ کو بھی حالیہ دورہ انگلستان میں شرمناک شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ ٹیم تینوں ٹیسٹ ہار گئی تھی۔ پاکستان نے تو اپنے پیکر کھلاڑی شامل کر کے ٹیم خاصی مضبوط کر لی ہے، لیکن نیوزی لینڈ میں ممکنہ آمد سابق کپتان گلن ٹرنر کی ہے۔ ان کی آمد سے ٹیم خاصی مضبوط تو ہو جائے گی، لیکن پھر بھی اسے پاکستان کا ہم پلّہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مارک برجس ٹیم کے نئے کپتان ہیں، معلوم ہوتا ہے قیادت کے بارے ان کا کھیل کافی متاثر ہوا ہے۔

بیٹنگ لائن میں کونگڈن کامیاب نہیں رہے۔ اسی طرح جان رائٹ، بروس ایجر، جان پارکر اور اینڈرسن کا کھیل بھی زیادہ قابلِ اعتماد ثابت نہیں ہوا، البتہ نیوزی لینڈ کا بیٹنگ ہیرو جیفری ہوورتھ کی صورت میں پاکستانی بولروں کے لئے مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ رچرڈ ہیڈلی واحد فاسٹ باؤلر ہے جو پاکستانی بیٹسمینوں کے لئے خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔ کولنج ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ڈائیل ہیڈلی، بریس ویل اور لانس کیرنس ایسے بولر نہیں جو پاکستان کے لئے خطرہ پیدا کر سکیں۔ سپننگ شعبے میں سٹیفن بوک کے خلاف رنز بنانا خاصا مشکل ہوگا۔ بہرحال نیوزی لینڈ کی ٹیم پاکستان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط نہیں اور پاکستان کو اسے شکست دینے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔

آسٹریلیا کی ٹیم آج کل انگلستان کے خلاف ایشیز کھیل رہی ہے اور دو میچ ہار چکی ہے۔ گراہم ییلپ کی قیادت میں ٹیم ابھی ارتقائی مراحل میں ہے۔ اس میں اگرچہ گریم وڈ، پیٹر ٹوہی اور روڈنی ہوگ جیسے کھلاڑی ہیں، لیکن انگلستان کے خلاف اس کی کارکردگی سے پاکستان کے خلاف اس کے امکانات کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

مشتاق محمد کی سابقہ کامیابیوں کے پیش نظر موجودہ قومی ٹیم سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ٹیم نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے دورے سے انتہائی کامیاب واپس لوٹے گی۔

بولنگ

نام	گیند پھینکے	رنز دیے	وکٹ حاصل کئے	اوسط	بہترین بولنگ	پانچ وکٹ فی اننگز	دس وکٹ فی میچ
سرفراز نواز	۷۰۸۳	۳۰۵۰	۹۹	۳۰.۸۱	۶ - ۸۹	۳	-
عمران خان	۵۰۹۶	۲۴۸۶	۷۶	۳۲.۷۱	۶ - ۶۳	۴	۱
مشتاق محمد	۴۵۱۳	۲۰۰۴	۶۸	۲۹.۴۷	۵ - ۲۸	۲	-
آصف اقبال	۳۵۷۴	۱۴۰۱	۵۰	۲۸.۰۲	۵ - ۴۸	۲	-
اقبال قاسم	۳۲۱۳	۱۱۶۱	۲۹	۴۰.۰۳	۴ - ۸۴	-	-
ماجد خان	۲۶۸۰	۱۰۷۱	۲۴	۴۴.۶۲	۴ - ۴۵	-	-
سکندر بخت	۱۶۸۲	۸۴۵	۲۱	۴۰.۲۴	۴ - ۱۳۲	-	-
جاوید میاں داد	۱۲۲۲	۵۳۶	۱۶	۳۳.۵۰	۳ - ۷۴	-	-
مدثر نذر	۲۰۴	۱۱۵	۵	۲۳.۰۰	۲ - ۴	-	-

نوٹ:۔ طلعت علی، ظہیر عباس، محسن خان، ہارون رشید اور وسیم باری نے بالترتیب ۴۲، ۲۰، ۸، ۸ اور ۸ گیند پھینکے اور ۷، ۲، ۳، ۲ اور ۳، رنز دے کر کوئی وکٹ حاصل نہیں کی۔

پاکستانی کھلاڑیوں کا ریکارڈ

نام	میچ	اننگز	ناٹ آؤٹ	بہترین سکور	کل رنز	سنچریاں	نصف سنچریاں	اوسط	کیچ	سٹمپڈ
مشتاق محمد	۵۲	۹۱	۷	۳۰۱	۳۴۳۳	۱۰	۱۹	۴۰-۸۷	۳۷	-
آصف اقبال	۴۸	۸۳	۵	۱۷۵	۲۹۴۷	۹	۱۰	۳۷-۷۸	۳۰	-
ماجد خان	۴۰	۷۰	۲	۱۶۷	۲۸۷۳	۵	۱۳	۴۲-۲۵	۵۲	-
ظہیر عباس	۲۹	۵۲	۳	۲۷۴	۲۱۶۶	۵	۷	۴۴-۲۰	۱۸	-
جاوید میانداد	۱۶	۲۷	۷	۲۰۶	۱۳۵۲	۴	۷	۶۷-۶۰	۱۲	-
وسیم باری	۴۵	۶۷	۱۶	۸۵	۸۳۹	-	۵	۱۶-۴۵	۱۰۴	۱۵
ہارون رشید	۱۲	۲۱	۱	۱۲۲	۷۲۷	۲	۳	۳۶-۳۵	۶	-
عمران خان	۱۸	۳۰	۴	۵۹	۶۰۷	-	۱	۲۳-۲۵	۸	-
مدثر نذر	۹	۱۵	-	۱۱۴	۵۲۸	۱	۳	۳۵-۲۰	۵	-
سرفراز نواز	۲۹	۳۹	۷	۵۳	۴۸۹	-	۲	۱۵-۲۸	۱۷	-
طلعت علی	۷	۱۲	۱	۵۷	۲۴۳	-	۱	۲۲-۰۹	۳	-
محسن حسن خان	۴	۶	-	۴۶	۲۳۵	-	-	۳۹-۱۷	۳	-
اقبال قاسم	۱۴	۱۷	۶	۲۹*	۶۳	-	-	۵-۷۳	۱۲	-
سکندر بخت	۹	۱۱	۵	۲۲*	۶۰	-	-	۱۰-۰۰	۱	-

نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں قومی ٹیم کا پروگرام

نیوزی لینڈ میں

تاریخ	مقابلہ	مقام
جنوری ۱۳	انٹرنیشنل الیون	آک لینڈ
〃 ۱۴	انٹرنیشنل الیون	کرائسٹ چرچ
〃 ۱۶ تا ۱۸	سنٹرل ڈسٹرکٹس	پالمرسٹن نارتھ
〃 ۲۰ تا ۲۲	ولنگٹن	ولنگٹن
〃 ۲۴ تا ۲۶	ینگ نیوزی لینڈ	روٹوروا
〃 ۲۷ تا ۲۹	ناردرن ڈسٹرکٹس	ہیملٹن
فروری ۲، ۳، ۴، ۶، ۷	نیوزی لینڈ (پہلا ٹیسٹ)	کرائسٹ چرچ
〃 ۱۰ تا ۱۲	اوٹیگو	ڈنیڈن
〃 ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۱	نیوزی لینڈ (دوسرا ٹیسٹ)	نیپیئر
〃 ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸	نیوزی لینڈ (تیسرا ٹیسٹ)	آک لینڈ

آسٹریلیا میں

تاریخ	مقابلہ	مقام
مارچ ۳، ۴، ۵، ۶	نیو ساؤتھ ویلز	سڈنی
〃 ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵	آسٹریلیا (پہلا ٹیسٹ)	ملبورن
〃 ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰	ساؤتھ آسٹریلیا	ایڈیلیڈ
〃 ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹	آسٹریلیا (دوسرا ٹیسٹ)	پرتھ

مسئلہ یہ ہے

ورنیکلر اساتذہ سے "ناانصافیاں"

ورنیکلر اساتذہ (او ٹی، پی ٹی، آئی ایس وی اور ڈرائنگ ماسٹرز) کے حقوق کا قطعی طور پر تحفظ نہیں. اس طبقے کے اساتذہ کے ساتھ ماضی میں بھی ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں اور آج تک ان اساتذہ کا کوئی بھی پرسان حال نہیں. نوکر شاہی نے اس طبقہ کے ساتھ نہ جانے اس قسم کا ناروا سلوک کیوں رکھا ہوا ہے. ان کے ساتھ کام کرنے والے سیکنڈری سکول ٹیچروں کو تو ان کی کل تعداد کے ۳۰ فیصد حصہ پر سلیکشن گریڈ دیا جا رہا ہے، مگر ان کے شانہ بشانہ کام کرنے والے اساتذہ سے کل تعداد کے ۱۵ فیصد کو سلیکشن گریڈ دیا جا رہا ہے. سکول ٹیچروں کو بھی آج سے تین سال پیشتر ۱۵ فیصد کے حساب سے سلیکشن گریڈ دیا جاتا تھا جسے بعد ازاں ۳۰ فیصد کر دیا گیا، مگر ورنیکلر اساتذہ کا سلیکشن گریڈ ۱۵ فیصد کے حساب سے جاری رکھا گیا. اس صریحاً زیادتی نے ورنیکلر اساتذہ کا سکون چھین لیا ہے — ان کی مسلسل عرضداشتوں پر آج تک کسی نے توجہ ہی نہ دی. براہ کرم ان کی کل تعداد کے ۱۵ فیصد کے بجائے ۳۰ فیصد اساتذہ کو سلیکشن گریڈ دیا جائے. حال ہی میں محکمہ تعلیم نے سینیئر انگلش ٹیچروں کو ایس ایس ٹی اور سی ٹی اساتذہ کو ای ایس ٹی کے مخفف سے نوازا ہے اور بقیہ اساتذہ کو اس ضمن میں نظر انداز کر دیا گیا ہے. او ٹی اساتذہ کو ایس وی ٹی اور دیگر اساتذہ کو بھی ای ایس ٹی قرار دیا جائے. اس سے پیشتر ورنیکلر اساتذہ کو ۵ فیصد کے حساب سے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر تعینات کیا جاتا تھا اب اسے بند کر دیا گیا ہے، اسے بحال کیا جائے.

ثانوی تعلیمی بورڈوں میں ورنیکلر اساتذہ کے حقوق کا کوئی تحفظ نہیں. ان اساتذہ کو ایف اے اور میٹرک کے امتحانوں پر صرف نگران تعینات کر دیا جاتا ہے. اگر انہیں ان امتحانات پر ممتحن اور نائب ممتحن تعینات کر دیا جائے، تو یہ دیگر اساتذہ کی نسبت بہتر کارکردگی دکھا سکتے ہیں. ممتحن اور نائب ممتحن کے تقرر کے لئے ورنیکلر اساتذہ کا ۵۰ فیصد کوٹہ مختص کیا جائے. نیز اردو، اسلامیات لازمی، اسلامیات اختیاری، فارسی، عربی، ڈرائنگ، زراعت، تربیت جسمانی پر ورنیکلر اساتذہ ہی کو ممتحن مقرر کیا جائے. نصاب کمیٹیوں میں بھی ورنیکلر اساتذہ کو نمائندگی دی جائے.

ایس اے عزیز، صدر،

ایس ای ایس (ورنیکلر سیکشن) ٹیچرز ایسوسی ایشن راولپنڈی ڈویژن

ستیانہ بنگلہ کے مسائل

ستیانہ بنگلہ، فیصل آباد سے پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے. ستیانہ بنگلہ اور اس کے ارد گرد کے مواضعات اور دیہات کے باسیوں کو اپنی مختلف ضروریات کے لئے روزانہ ہزاروں کی تعداد میں فیصل آباد جانا پڑتا ہے. ٹرانسپورٹ کا مسئلہ یہاں کے مسافروں کے لئے ایک عرصے سے وبال جان بنا ہوا ہے. پرائیویٹ کمپنیوں کی بسیں زیادہ تر اوکاڑہ جاتی ہیں اور وہ یہاں کے مسافروں کو کسی صورت بھی نہیں اٹھاتیں. جو پرائیویٹ بسیں صرف ستیانہ بنگلہ کے لئے چلتی ہیں، ایک تو وہ تعداد میں بہت کم ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کو دیکھ کر چھکڑوں کا گمان ہوتا ہے. کسی بھی شریف آدمی کو یہاں تک پہنچنے کے لئے تین چار گھنٹے ضائع کرنا پڑتے ہیں. گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی سروس بھی یہاں چلتی ہے، لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہے. ٹرانسپورٹ کے مسئلے کے علاوہ یہاں کا اہم مسئلہ سیم و تھور کا ہے. زمینیں تیزی سے خراب ہو رہی ہیں اور اس موذی مرض کے تدارک کے لئے حکومت کی کوئی قابل ذکر سرگرمی نظر نہیں آتی.

محکمہ واپڈا نے تقریباً چار پانچ ماہ پیشتر یہاں کے کچھ مواضعات کو بجلی دینے کا پروگرام بنایا، لیکن ابھی تک سرگرمی سے کام نہیں ہو رہا. بجلی مہیا کرنے کے اس پروگرام میں ہمارے گاؤں چک نمبر ۱۲۹ گ ب کا نام بھی شامل تھا.

متعلقہ حکام سے گزارش ہے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے کی طرف فوری توجہ دیں. (ذوالفقار علی خان، ستیانہ بنگلہ ضلع فیصل آباد)

لیکچراروں کو تبدیل کیا جائے

گذشتہ اکتوبر میں وفاقی وزیر چودھری رحمت الٰہی کے دورہ قصور کے موقع پر کھلی کچہری میں قصور کے شہریوں اور طلبہ نے اسلامیہ کالج کے کچھ لیکچراروں کی مذموم سرگرمیوں کو بے نقاب کیا تھا. وفاقی وزیر کو بتایا گیا تھا، ایک لیکچرار مسٹر احسان الٰہی ناوک تو کٹر کمیونسٹ ہیں اور کھلے عام کمیونزم کا پرچار کرتے ہیں. مسٹر ناوک کے علاوہ ایک لیکچرار مسٹر فرید احمد ہیں جو قادیانی ہیں. مسٹر فرید چونکہ قصور کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں، شاید اسی لئے ارباب اختیار نے انہیں ان کے گھر تعینات کر رکھا ہے. کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ایک تو وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں، اور دوسرے اپنے مذموم عزائم کو "بحسن وخوبی" عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہیں. اسی طرح مسٹر احسان الٰہی ناوک تقریباً گذشتہ دس سال سے اس کالج میں مقیم ہیں. خدا کے وجود کے منکر، رسالت کے منکر، مسٹر احسان الٰہی ناوک آخر کب تک یہاں کی فضا میں زہر گھولتے رہیں گے؟

قصور کے شہریوں کے ساتھ وفاقی وزیر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان لیکچراروں کے بارے میں متعلقہ حکام سے بات کریں گے، مگر ابھی تک انکے خلاف کوئی کارروائی منظر عام پر نہیں آئی. ہم ان دونوں لیکچراروں کے اس تکلیف دہ رویے سے بہت نالاں ہیں. ارباب اختیار سے درخواست ہے کہ ملک و ملت کے دشمن ان اساتذہ سے ہمیں جلد نجات دلائی جائے.

(متعدد افراد کے دستخط، قصور شہر)

سیم نالہ فوری طور پر بنایا جائے

ہمارے موضع رنسیکے ضلع گجرات میں سیم اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ اس سے مکانوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے. یہاں کے عوام کے پرزور مطالبے پر گذشتہ سال حکومت نے سیم نالہ کی منظوری دی تھی، لیکن ابھی تک اس کا کام شروع نہیں ہوا. متعلقہ حکام سے درخواست ہے کہ آئندہ موسم برسات سے پہلے پہلے اس نالے کو مکمل کیا جائے، ورنہ زمینیں بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائیں گی.

(اہالیان موضع رنسیکے ضلع گجرات)

ان بسوں کو فوراً تبدیل کیا جائے

لاہور قصور روٹ پر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ جو بسیں چلا رہی ہے، وہ مسافروں کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث ہیں. پہلے بھی یہ بات ذمہ داروں کے علم میں لائی گئی، مگر نہ معلوم بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے قوم کے ناخدا کب تک انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک جاری رکھیں گے. یہ بسیں جو اس روٹ پر چل رہی ہیں، دراصل لوکل روٹوں کے لئے ہیں. انہیں اس لمبے روٹ پر ایک سازش کے تحت چلایا جا رہا ہے. حکام سے پرزور درخواست ہے کہ ان بسوں کو لوکل روٹ پر لائیں اور وہاں دوسری (اس روٹ کے لئے موزوں، جیسا کہ فیصل آباد، گوجرانوالہ وغیرہ کی طرف چل رہی ہیں) بسوں کو فی الفور چلانے کا اہتمام کریں.

(رضا عابد حسین، لاہور)

آپکے مطالعے کے لیے بہترین کتابیں

① آزادی کے چراغ	مشکور حسین یاد	۸/۰۰
② چند نکات کی تصویر	الطاف حسن قریشی	۲/۰۰
③ ہمہ یاراں دوزخ	صدیق سالک	۲۵/۰۰
④ ڈکٹیٹر کون؟	ایس ایم ظفر	۱۲/۰۰
⑤ اولادِ آدم	محمد منور	۸/۵۰
⑥ جوہرِ اندیشہ	مشکور حسین یاد	۱۲/۰۰
⑦ ستارے چھپاتے ہیں	مشکور حسین یاد	۱۲/۰۰
⑧ پاسبانِ حرم فیصل	محمد صدیق قریشی	۱۲/۰۰
⑨ سلطان ٹیپو	سجاد ہاشمی	۵/۰۰
⑩ بڑھاپا اور اس کا سدباب	حکیم محمد اقبال ایم اے	۴/۰۰
⑪ سمرقند و بخارا کی خونیں سرگزشت	اعظم ہاشمی	۲/۲۵
⑫ آخری خسر	سید ضمیر جعفری	۳/۰۰
⑬ بارِ سفر	باقی صدیقی کا مجموعہ کلام	۵/۰۰
⑭ انتخاب کلام اکبر	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	۸/۰۰
⑮ سونار بنگلہ	ڈاکٹر محمود الرحمٰن	۷/۰۰
⑯ یادِ شاہد	شاہد احمد دہلوی کی شخصیت	۲۰/۰۰
⑰ آدابِ الحج	حکیم مشتاق احمد اصلاحی	۴/۵۰

منی آرڈر کے ذریعے پیشگی قیمت بھیج کر یا بذریعہ وی پی طلب کیجیے.

مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد
لاہور ۲۵ (پاکستان)

این ڈی پی کو بدنام کرنے کی سازش

آپ کے شمارے ۲۴ تا ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ء میں کوئٹہ سے آپ کے رپورٹر مسلم قریشی صاحب کی رپورٹ پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ اس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ رپورٹر حضرات عموماً ہوٹلوں میں بیٹھ کر رپورٹ مرتب کر لیتے ہیں اور اسی لیے آج تک بلوچستان کے متعلق حقیقی رپورٹ سامنے نہیں آئی۔ ہفت روزہ "زندگی" کو بلوچستان میں اعتبار اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اسے تلاش کر کے پڑھتے ہیں اور گذشتہ دورِ آمریت میں آپ نے جس جرأت کے ساتھ حق و صداقت کی آواز اٹھائی، اس پر وہ مدیرانِ "زندگی" کو تحسین و عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر یہ میگزین بھی حقائق کی پٹڑی سے اتر جائے تو کس سے شکایت کریں؟ ہمیں افسوس ہے کہ صرف ایک پارٹی کو بدنام کرنے کے سلسلے میں سازش کی جا رہی ہے، یعنی پہلے نیپ اور اب این ڈی پی۔ اگر کوئی اس میں شامل ہوتا ہے، تو کوئی خبر اخبار میں نہیں چھپتی، لیکن کوئی پارٹی چھوڑ جاتا ہے، تو بڑی خبر بن جاتی ہے۔ مثلاً محمد اکبر اچکزئی صوبائی کیٹی تک کے ممبر نہیں، مگر آپ کے رپورٹر نے انہیں مرکزی کیٹی کا ممبر بنا دیا ہے۔ ضلع ژوب سے بعض لوگ نکلے نہیں بلکہ پارٹی سے نکالے گئے ہیں۔

آپ کے رپورٹر نے لکھا ہے کہ مکران سے ایک صاحب اس لیے گئے کہ پارٹی میں نماز کی پابندی نہیں۔ میں یہ دعوے سے کہتا ہوں کہ ہر میٹنگ کی کارروائی نماز کے لیے روک دی جاتی ہے۔

(غلام دستگیر کاکڑ، جائنٹ سیکرٹری، این ڈی پی۔ بلوچستان)

سیاست دان اپنی اصلاح کریں

گزشتہ برسوں اور خاص طور پر ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے دوران ملک کے اکثر سیاست دان بار بار جلسوں میں یہ اعلان کرتے تھے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ عوام کی بے مثال قربانیوں اور خدا کی تائید سے بھٹو کا تختہ الٹ گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ملک کے اندر نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے لیے کچھ پیش رفت شروع کی ہے۔ دفاتر میں نماز کا اہتمام حکماً ہو چکا ہے۔ شریعت بنچوں کا قیام بھی زیرِ تشکیل ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی اصلاحِ احوال کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارے سیاسی رہنما ان اقدامات میں سے جہاں ایک طرف سُقم دور کراتے اور انہیں اور زیادہ مؤثر بناتے، اس کے ساتھ ساتھ نماز ایسے اچھے اقدامات کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ راسخ کرنے میں حکومت کی مدد کرتے۔ اُلٹا انہوں نے جونہی یہ کریڈٹ جنرل صاحب کے کھاتے میں جاتے دیکھا ہے، انتخابات کی رٹ لگانا شروع کر دی ہے اور ہر بات عوام کے حوالے سے کرتے ہیں، حالانکہ پاکستان کے عوام نے قربانیاں نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے لیے دی تھیں۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی اب گفتگو میں نظامِ مصطفیٰؐ کا ذکر ذرا کم کر دیا ہے اور انتخابات کے شیڈول پر زیادہ زور ہے۔

ان قلابازیوں سے ایک چیز بڑی واضح ہو کر سامنے آئی ہے کہ پاکستان کے سیاست دانوں کے ذہن میں اس نظریاتی ملک کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ کچھ اپنی مجبوریوں اور کچھ اپنی ضرورتوں کو لے کر سیاست میں آتے ہیں اور پھر ان کے منہ سے بے ساختہ نکلے ہوئے بیانات بذاتِ خود گاہے گاہے ان کے تضادِ اندرون و بیرون کو آشکارا کر جاتے ہیں۔ پھر کئی لیڈرانِ گرامی نے نماز کی باقاعدگی اور گھر میں پردہ کے اہتمام ایسی ضروری کوالیفکیشن بھی اپنے وجود یا اپنے گھر میں پیدا نہیں کی ہیں کہ جو پاکستان کی لیڈرشپ کے لیے ضروری ہیں۔ (خلیل الرحمٰن، اچھرہ، لاہور)

ائیر مارشل تصحیح فرمالیں

۱۹ دسمبر کے اخبار میں ائیر مارشل اصغر خان صاحب کا بیان پڑھ کر نہایت افسوس ہوا۔ وہ فرماتے ہیں "چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب نے اختیارات سنبھالتے ہی تین ماہ کے اندر اندر الیکشن کرانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ اپنے وعدے سے مکر گئے"۔ ائیر مارشل صاحب اپنی پوزیشن کو بھولتے ہوئے کتنا بڑا جھوٹ کہہ گئے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق الیکشن کی تیاری کے لیے سیاسی جلسوں، جلوسوں کی اجازت دے دی تھی، لیکن جب سیاسی لیڈروں نے حسبِ عادت ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا، تو جنرل صاحب کو پابندی لگانی پڑی اور الیکشن کو ملتوی کرنا پڑا۔ پھر ائیر مارشل صاحب فرماتے ہیں "اسلام پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے"۔ یہ البتہ آپ نے بالکل سچ فرمایا ہے، اسی لیے تو سوشلسٹ اور کمونسٹ بھی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ ائیر مارشل صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت کا ساتھ دینے والی جماعتیں الیکشن سے اس لیے گھبراتی ہیں کہ انہیں اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہے۔ ائیر مارشل صاحب کی یہ غلط فہمی تو الیکشن کے دوران میں ہی دور ہو گی، کیونکہ یہ دنیا امید پہ ہی قائم ہے۔ سیاست دانوں نے ملک اور قوم کو پہلے ہی تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ خدا آئندہ ملک اور قوم کو محفوظ رکھے۔ (ڈاکٹر محمد سعید قریشی مسلم بازار سرگودھا)

نورانی میاں اور نمازِ مغرب

"زندگی" کے گزشتہ شمارہ (۲۴ تا ۳۰ نومبر) میں اکرام غازی کی رپورٹ میں یہ پڑھ کر سخت افسوس ہوا کہ نورانی میاں کراچی میں اپنی حالیہ پریس کانفرنس کے دوران نمازِ مغرب گول کر گئے اور سول کابینہ میں قومی اتحاد کے وزراء پر برستے ہوئے اور نظامِ مصطفیٰؐ پر اپنی اجارہ داری جتلاتے ہوئے، وہ اتنے بے خود ہوئے کہ یہ بھی خیال نہ کیا کہ اذان ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ نماز کا وقت بھی جانے دیا۔ رپورٹ کے مطابق اس روز پونے چھ بجے اذان ہوئی اور نورانی صاحب چھ بج کر پچیس منٹ تک پریس کانفرنس فرماتے رہے۔ کوئی اور نماز ہوتی، تو ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہ فرض کر لیتے کہ نورانی صاحب نے پریس کانفرنس کے بعد نماز کا اہتمام کر لیا ہو گا۔ لیکن نمازِ مغرب کا وقت تو بہت مختصر ہوتا ہے اور پھر اسلام میں نماز کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

علماء کی ایک جماعت کے سربراہ، ایک ممتاز عالمِ دین اور سوادِ اعظم کی سربراہی کے دعویدار کی جانب سے نماز کے بارے میں یہ کوتاہی ایک ایسی حرکت ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ کیا نظامِ مصطفیٰؐ کے اجارہ دار جناب نورانی، اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن سے اپنی اس لاپرواہی کی کوئی وضاحت فرمائیں گے۔ یاد رہے کہ قیامت کے روز خدائے ذوالجلال سب سے پہلے نماز کے بارے میں استفسار فرمائیں گے۔

(یاور منیر۔ امر سدھو، لاہور)

ازسرِنو تحقیقات کا مطالبہ

ہماری چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اپیل ہے کہ مرزا عبدالقدیر بیگ، امیر جماعتِ اسلامی ضلع سانگھڑ کے قتل کی کسی قابلِ اعتماد ایجنسی کے ذریعے ازسرِنو تحقیقات کروائی جائے اور چالان خصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا جائے۔ پولیس نے اگرچہ قاتلوں کو گرفتار کر لیا ہے اور یہ اس کا قابلِ تعریف کارنامہ ہے، لیکن قتل کے محرکات، اس کا سبب اور اس کے پس پردہ سازش کا سراغ لگانے میں وہ قطعی ناکام رہی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے تفتیش کے اس اہم ترین پہلو کو دانستہ نظر انداز کیا، بلکہ اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ پہلے سے طے شدہ ایک منصوبے اور ملزمان کے اقبالی بیانات کو بنیاد بنا کر تفتیش کا دائرہ محض اس مفروضے تک محدود رکھا کہ یہ قتل کسی سازش کا نتیجہ نہیں، بلکہ محض شناخت میں غلطی کی بناء پر سرزد ہوا ہے؛ حالانکہ ملزمان کے حالات و کوائف جاننے کے بعد کوئی شخص بھی اس کہانی پر یقین نہیں کر سکتا کہ قاتل مرزا عبدالقدیر بیگ اور پیر خالد سرہندی سے اس درجہ ناواقف ہو سکتے تھے کہ انہوں نے دن کی روشنی میں کافی دیر تک مرزا عبدالقدیر بیگ کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے اور ان کا پیچھا کرنے کے بعد ان کو پیر خالد سرہندی سمجھ کر قتل کر دیا۔ شہداد پور کے شہریوں کے نزدیک یہ بات ناقابلِ یقین اور بعید از قیاس ہے۔ دوسری طرف خود ملزمان کے مطابق ان کی مرزا عبدالقدیر بیگ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اس قتلِ ناحق کے پیچھے کسی سازش کا موجود ہونا امرِ لازم ہے۔ اس سازش کے امکان کو اپنی تفتیش میں قطعی نظر انداز کر دینا پولیس کی کارروائی کو مشکوک بنا دیتا ہے، اس لیے اب یہ ضروری ہے کہ کسی قابلِ اعتماد ایجنسی سے نئے سرے سے صحیح خطوط پر تفتیش کروائی جائے اور چالان خصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا جائے، تاکہ اس سازش کے پس پردہ ان ظالموں کے چہرے بے نقاب ہو سکیں جنہوں نے ایک بے گناہ انسان کی جان لینے کا منصوبہ بنایا اور اسے ملزمان کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

(میاں محمد شوکت، جنرل سیکرٹری، جماعت اسلامی، [illegible])

مضامین کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھ کر ارسال کریں۔

ادارہ

R.L. No 7564 PHONE: 413809
ZINDAGI
WEEKLY LAHORE

اُردو ڈائجسٹ

جنوری ۷۹ء

سب سے جُدا سب سے الگ

یحییٰ خان سے

الطاف حسن قریشی

کا

خصوصی انٹرویو

- سکندر مرزا مجھے گرفتار کرانا چاہتے تھے
- شاہ ایران نے پاکستان کو تیل کا ایک تیار کنواں دینے کی پیشکش کی تھی
- گول میز کانفرنس کے موقع پر ایک رات مجیب مجھ سے ملنے آیا تھا
- بھٹو کی شراب نوشی نے اقوامِ متحدہ میں سارا کام خراب کر دیا
- مشرقی محاذ سے میں پہلے ہی دِن مایوس ہو گیا تھا
- چین کے دورے پر بھٹو، گل حسن اور ایئر مارشل رحیم میں سازش ہوئی
- چیف آف جنرل اسٹاف میرے علم کے بغیر احکام جاری کرتا رہا

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے فیصلہ کُن لمحات اور پُراسرار شخصیتوں کا انکشاف

قیمت ۵ روپے

DR. DAUD BOOK DEPOT KARACHI